

دوستدار احمد

دوستدار احمد

”اُس کے سامنے آزادی اور مسرت کی وہ دنیا تھی  
جہاں پانی میں لہریں اٹھتی تھیں، پھول کھلتے تھے، درخت  
جھومتے تھے، جہاں زندگی اپنی تمام دل فریبیوں کے  
ساتھ موجود تھی۔۔۔۔۔ اس نے بے بسی کی حالت  
میں آسمان کی طرف دیکھا اور کہا:  
”بھگوان! تو نے اسے شوردر کیوں بنایا؟ — اور  
اگر اسے شوردر بنایا تھا تو مجھے اونچی ذات میں کیوں پیدا  
کیا۔“

## اپنا وطن

اچھنڈون اڈھر اڈھر بھگنے گئے بعد کنول کو دریا بے بنائش دکھائی دیا اور  
پانچ دن دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد وہ دوسرے کنارے  
پر اپنے آبائی وطن کی ان سرسبز پہاڑیوں کو دیکھ رہی تھی جو ایک طویل مدت کے  
لیے تہذیب اور جہالت کے درمیان حد فاصل کا کام دے چکی تھیں۔ جہن کی بدولت  
کئی برس تک آزاد قبائل کے جھوپڑے برہمنی سماج کی آتشیں انتقام سے  
محفوظ رہے تھے۔

راوی سے بیس تک سفر کے دوران کنول کئی بستیاں اور شہر دیکھ چکی تھی  
وہ شہر جہاں اونچے ایوانوں میں سماج کے مقدس بیٹوں کی غنیمت کے جھنڈے  
لہراتے تھے۔ وہ بستیاں جو مشوروں کی کمتری اور بے بسی کا اعتراف کرتی  
تھیں۔

شہروں میں بسنے والے انسانوں کے متعلق کنول بہت کچھ جانتی تھی۔  
بدھو کچھ تو کنول اور سکھ لوگ کے ساتھ رہ کر اور کچھ رامو کی داستانیں سن کر اس  
بانت پر ایمان لایا تھا کہ انسانیت کی تمام برائیاں ان اونچے ایوانوں میں پوش  
پاتی ہیں چنانچہ جب اسے کوئی شہر دکھائی دیتا تو وہ کنول سے مشورہ لیے بغیر اپنا  
راستہ تبدیل کر دیتا۔  
سفر کے شروع میں وہ بستی کو اپنے ہم جنسوں کا مسکن خیال کرتا تھا۔

لیکن پہلی ہی منزل میں اسے معلوم ہو گیا کہ شہروں کی وابستگیوں میں بھی آپکی ہے۔ ایک شام یہ لوگ ایک گاؤں کے قریب پہنچے۔ بدھوں نے گدھوں سے سامان اتارا اور بچوں کو کنول کی حفاظت میں چھوڑ کر گاؤں سے آگ لینے چلا گیا۔ اس گاؤں میں اسے سرکنڈے کی جھونپڑیوں کی بجائے خوبصورت مکان دکھائی دیے۔ اچانک ایک مکان سے جس کا دروازہ کھلا تھا اسے ناقوس اور گھنٹیوں کی صدا آئی۔ بدھوں نے پریشانی کی حالت میں جھانک کر اندر دیکھا۔ دیکھے کی روشنی میں اسے ایک سیاہ پتھر کی مورتی دکھائی۔ بدھو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اس نے کنول کے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے کہا: میں بھی حیران تھا کہ یہاں ایسے مکان کہاں سے آگئے۔ چلو بہن! یہاں ٹھہرنا بہت خطرناک ہے۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو مصیبت آجاتی۔

بدھوں نے جلدی سے گدھوں پر سامان لادا اور گاؤں سے ایک کوس دور جا کر دم لیا۔ اس کے بعد بدھو کسی بستی میں داخل ہوئے۔ پہلے مٹی کے مکانوں اور گھاس پھوس کی جھونپڑیوں میں اچھی طرح تیز کر لیتا۔

شور بدھو اور کنول کو غریب الوطن سمجھ کر نہایت اخلاص سے پیش آتے۔ آگ کی بجائے ان کو پکا پکانا کھانا دینے پر اصرار کرتے۔ انہیں بستی سے باہر ٹھہرنے کی بجائے اپنے گھروں میں ٹھہرنے پر مجبور کرتے۔ بدھو کو ان کی یہ تمام باتیں پسند تھیں لیکن رات کے وقت ان کے منہ سے دیولیوں اور دیوتاؤں کے عجیب و غریب قصے سن کر وہ گھبرا اٹھتا۔ رامو کے دیوتا کی مہبت اور سکھ دیو کی مظلوم شکل اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی۔ وہ رات بھر خوفناک پسینے دیکھتا۔ چند دن کے سفر کے بعد وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ آئندہ

کسی شہر کے ہاں نہیں ٹھہرے گا۔

بعض اوقات وہ چلتے چلتے پریشان ہو کر کنول سے کہتا: مجھے ڈر ہے کہیں ان لوگوں میں بھی دیوتاؤں کا مرض نہ پہنچ چکا ہو۔ بدھو کی طرف سے اس قسم کے خدشات کا اظہار کبھی کبھی کنول کو بھی پریشان کر دیتا اور وہ اپنے دل سے یہ سوالات پوچھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہاں جا رہی ہوں۔ کیوں جا رہی ہوں۔ وہاں میرے لیے کیا ہوگا؟ لیکن تھوڑی دیر بعد اس پر ایک بے حسی طاری ہو جاتی اور بدھو محسوس کرتا کہ کنول نیم بیداری کی حالت میں کروش بدھو کے بعد پھر گہری نیند سو گئی ہے۔ اگر بدھو کوئی بات بار بار دہراتا تو اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اس کی طرف متوجہ ہوتیں اور ان کی رہی رہی چمک آنسوؤں کے پردوں میں چھپ کر رہ جاتی۔

کنول پر وہ محویت طاری ہو چکی تھی جو کسی انسان میں مایوسی اور بے بسی کی انتہا دیکھنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ جو ایک جلتے جاگتے انسان کو پتھر کا مجسمہ بنا دیتی ہے۔ ایک اضطراب مسلسل اس کے لیے ایک دائمی سکون بن چکا تھا۔ اس کے دل میں جو غم کے سمندر کی آخری گہرائی میں غوطے کھا رہا تھا۔ زندگی کے ادنیٰ تفکرات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

بدھو بار بار اسے گدھے پر سوار کرنے کی کوشش کرتا لیکن وہ پیدل چلنے پر اصرار کرتی۔ منزل مقصود کی طرف اس کے پاؤں کبھی ڈھیلے اور کبھی تیز اٹھتے لیکن وہ رک جانے پر قادر نہ تھی۔

انتہائی مایوسی کبھی کبھی انسان کو ناممکنات کا قائل بنا دیتی ہے۔ صبرِ اہل  
پیاسے سراب کی حقیقتوں سے واقف ہونے کے باوجود اسے دریا سمجھ کر اس  
کی طرف بھاگتے ہیں۔ لگتا ہوا سوداگر سبز تار یک غار میں جو اسرات کے انبار دیکھتا  
ہے۔ کنول ماضی کو ایک خواب سمجھ کر اس کی تعبیریں سوچتی۔ کبھی اسے خیال آتا  
کہ سکھ دیو مرانہیں۔ میں نے شاید یہ تمام واقعات خواب کی حالت میں دیکھے ہیں  
لیکن اپنے ساتھ مادہ ہوا شانتا اور بدھ کو دیکھ کر وہ اضطرابی حالت میں اکثر یہ  
پوچھ بیٹھتی "بھیا! وہ واقعی مر چکے ہیں؟"

بدھ کو ایک لمحے کے لیے مرکز مایوسی اور حسرت کے اس محسوس کی طرف  
لکھتا اور کانپتے ہوئے ہونٹوں کو بھیج کر آواز کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے  
ہوئے کہتا "کنول بہن! اب ہم صبر کے سوا کمری کیا سکتے ہیں؟"۔ آواز  
کنول کی طرح بدھ کے لیے بھی سکھ دیو کی موت نے زندگی کا مقصوم بدل  
دیا تھا۔ سورج ہر صبح اپنی پرانی آب و تاب کے ساتھ نکلتا۔ ستارے ہر شام  
نودار ہوتے۔ چاند ہر رات اپنی شکلیں بدلتا۔ درخت اسی طرح کھڑے تھے۔ فضا  
میں پرندے اسی طرح اڑتے تھے۔ بیاس کی لہریں راوی کی لہروں سے مختلف  
نہ تھیں لیکن بدھ ویر محسوس کرتا تھا کہ اس کی کائنات میں ایک ایسا خلا پیدا ہو  
گیا ہے جو اب پر نہیں ہو سکتا۔

ساز ہستی کا وہ تار جس کی ہر جنبش کے ساتھ بدھ کی سادہ اور معصوم زندگی  
کی سرسبز قفس کرتی تھیں ٹوٹ چکا تھا۔ اس شخص کی طرح جسے ہاتھ پاؤں باندھ  
کر گہرے پانی میں پھینک دیا گیا ہو، بدھ کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا کہ انتہائی

کرب کی حالت میں وہ چنچیں مار کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا لیکن وہ طوفان  
جو دل سے دردناک چنچیں بن کر اٹھتا ہونٹوں تک پہنچتے پہنچتے ہلکی ہلکی آہوں اور  
سسکیوں میں تبدیل ہو کر رہ جاتا۔ بعض اوقات کنول اور بچوں کا خیال اسے  
ہونٹ بھیجنے پر مجبور کر دیتا اور آگ کے وہ شعلے جو دل سے اٹھتے پانی میں تبدیل  
ہو کر آنکھوں کے راستے بہہ نکلتے۔ آسمان کے ستاروں کے سوا جنہوں نے  
بار بار بدھ کی چھلکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا تھا اور خاک کے ان ذروں کے سوا  
جن میں بار بار اس نے اشکوں کے موتی لٹاتے تھے کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی  
چھوٹی مٹی دنیا میں کیا کیا طوفان اٹھتے ہیں۔

کنول کے کان اس کی آہوں اور اس کی نگاہیں اس کے آنسوؤں سے آشنا  
تھیں۔ اس کے خیال میں بدھ کو ایک مرد تھا ایک ایسا مرد جو زندگی کے ہر طوفان  
کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ صرف ایک رات جب وہ دریا کے کنارے سو رہے تھے  
اور کنول حسب معمول لیٹے لیٹے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے بدھ کو  
جو اس کے قریب منہ کے بل ریت پر لیٹا ہوا تھا یہ کہتے ہوئے سنا بھیا! تم  
کہاں ہو؟ اس کے بعد بدھ ویر تک ہچکیاں لیتا رہا۔

کنول کو پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ وہ آہوں اور آنسوؤں کی دنیا میں اکیلی نہیں  
اس نے کہا: بھیا! تم رو رہے ہو؟

بدھ نے کروٹ بدل کر اس کی طرف دیکھا اور کہا: بہن تم جاگ  
رہی تھیں؟

"سو نا اب میرے بس کی بات نہیں؟"

بدھ نے ذرا سنبھل کر کہا: بہن! ماہی گہرے تھے کہ تمہارا گاؤں ایک  
شہر بن چکا ہے اور وہاں راجہ کے سپاہیوں کی حکومت ہے۔ ہمیں شہر کے اندر

جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔

”بھیا! ہم شہر سے باہر جھونپڑی بنالیں گے۔“

”لیکن وہاں جا کر اگر شہر سے باہر جھونپڑی بنانی ہے تو ہمیں ان ماہی گیروں کے پاس کیوں نہ رہیں۔ یہ لوگ اگر دیوتاؤں کے متعلق اتنی باتیں نہ کریں تو بڑے نہیں بھیا! یہ تمہارے بھائی کی آخری خواہش تھی۔“

”لیکن انہیں یہ تو معلوم نہ تھا کہ دیوتاؤں کے پجاری وہاں قدم بچا چکے ہیں۔ بہن! مجھے پتا نہیں ان بچوں کا خیال ہے۔“

”بھیا! ایسی باتیں نہ کرو۔ آخر میری قوم کے اور لوگ بھی تو اس جگہ رہتے ہیں۔“

”بہن! تمہاری مرضی لیکن میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ کوئی ماہو اور شانتا سے دیوتاؤں کے متعلق باتیں کرے اس لیے میں تمہاری قوم کے لوگوں کے پاس رہنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ تمہاری جھونپڑی سب سے علیحدہ ہوگی۔“

”بھیا! میں خود کسی کے پاس نہیں رہنا چاہتی۔“

(۳)

صبح کا ستارہ آفتاب کی آمد کا پیغام دے رہا تھا۔ ماہتاب کے گرد نور کی موجوں کا دائرہ محدود ہو رہا تھا۔ تاروں کے قطبے مغوم مسکراہٹوں میں تبدیل ہو چکے تھے رات بھر فضا میں اڑنے والے جلنو گھاس میں چھپ بسے تھے۔ اس پاس کے درختوں پر چڑیاں چھپا رہی تھیں۔

مشرق کے بلند پہاڑوں کے عقب سے سرخ روشنی کی شعاعیں آسمان کی طرف اٹھ رہی تھیں اور شب کی سیاہ چادر مغرب کی طرف سمٹ رہی تھی۔ سورج

جوانگ کے انگارے کی طرح سرخ اور اپنی ضخامت سے کئی گنا بڑا نظر آتا تھا۔ آہستہ آہستہ پہاڑ کی چوٹی پر نمودار ہوا اور اس کی سرخ کرنوں کی بدولت بیاس کے شفات پانی میں غون کی آمیزش نظر آنے لگی۔ سورج کے سرخ چہرے پر بچھنے ہوئے لمبے کی سی سفیدی اور چمک پیدا ہونے لگی۔ اس کی ضخامت کم ہوتی گئی اور درختوں کے طویل اور وحندے سائے گھٹنے لگے۔ اس پاس کی جھاڑیوں میں مکڑی کے جالوں اور گھاس کی پتلیوں پر شبنم کے قطرے رنگ رنگ کے بیش قیمت موتی نظر آتے تھے۔

کنول حسب معمول سب سے پہلے بیدار ہو کر بکریوں کا دودھ دوہ رہی تھی ماہو اٹھ کر بیٹھ چکا تھا اور شانتا بیٹے بیٹے آنکھیں مل رہی تھی۔ بدھو دیر تک جاگنے کے بعد اب گہری نیند سو رہا تھا۔ کنول دودھ دوہ رہ کر اٹھی اور ماہو کی طرف دیکھ کر بولی، ”بیٹا! اٹھ کر نہالو۔ اپنے چچا کو بھی جگا دو۔“

چچا کے لفظ پر شانتا چونک کر اٹھی اور ماہو ابھی اٹھ کر جھانپے ہی رہا تھا کہ اس نے بھاگ کر بدھو کو جگا دیا۔

بدھو نے ایک دو بار آنکھیں کھول کر پھر سو جانے کی کوشش کی لیکن شانتا کے بار بار جھنجھوڑنے پر اٹھ کر انکڑائیاں لینے لگا۔

کنول نے کہا، ”بھیا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

اس نے جواب دیا، ”جسم ٹوٹ رہا ہے۔“

کنول نے کہا، ”پچھلے دنوں تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں آئے۔“

بدھو نے دریا کے کنارے تین چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی طرف دیکھا اور کہا، ”وہ آتے ہی ہوں گے۔“

ماہو نے جنوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”ماتا! ادھر دیکھو۔ وہ آجے ہیں۔“

کنول بدھو اور شانتیہ چھ مڑو دیکھنے لگے۔ کوئی پانچ سو قدم پر ایک چھوٹی سی بستی سے چند ماہی گیر ویا کی طرف آ رہے تھے۔

بدھو نے کہا "میں جلدی سے نہالوں۔ آؤ مادھو!"

بدھو اور مادھو نے بھاگ کر ویا میں پھلا نگلیں لگا دیں۔ تھوڑی دیر تیرنے اور چند بار غوطے لگانے کے بعد دونوں ویا سے باہر نکلے۔ اتنی دیر میں ماہی گیر کنول کے قریب پہنچ چکے تھے۔

ایک ماہی گیر نے جو دوسروں کی نسبت عمر رسیدہ معلوم ہوتا تھا کنول کے سامنے پانس کی ایک چھوٹی سی ٹوکری رکھ دی اور کہا "میں افسوس ہے کہ اپنے ہماری بستی میں ٹھہرنا پسند نہ کیا۔ اب جو کچھ تم کھاتے ہیں آپ کے لیے لائے ہیں آپ تھوڑا بہت کھالیں۔ ہم آپ کو ابھی پار پہنچا دیتے ہیں۔"

آپ نے بہت تکلیف کی یہ کہہ کر کنول نے ٹوکری کے اوپر سے بڑے پتے اٹھائے تو نیچے چند بوٹیاں اور مٹی کا ایک کھڑا مکھن سے بھر ہوا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد یہ مسافر اپنی بھڑوں، بکریوں اور گدھوں سمیت کشتیوں میں سوار ہوئے۔ ویا کا بہاؤ اگرچہ تیز تھا لیکن اس کی موجوں میں برسات کے ابتدائی ایام کی سرکشی نہ تھی۔ منجھدار میں ایک تیز لہر کشتیوں کو چند قدم نیچے کی طرف لے گئی لیکن ملاحوں نے جلد ہی ان کی رفتار پر قابو پا لیا اور تینوں کشتیاں کنا سے پہنچ گئیں۔ کنول نے ملاحوں کا شکریہ ادا کیا اور انہیں ایک بکری دینے کی کوشش کی۔

لیکن انہوں نے بیوہ کا مال لینے سے انکار کر دیا۔ ملاحوں کی جماعت کے دو آدمی آخری منزل تک کنول کا ساتھ دینا چاہتے تھے لیکن بدھو ہر اجنبی سے مرہم بڑھانے کے خلاف تھا اس نے کہا آپ نے ہمارے لیے پہلے ہی بہت تکلیف اٹھائی ہے اب ہماری منزل دور نہیں۔ ہم شام تک وہاں پہنچ جائیں گے۔

ایک ملاح نے پوچھا "آپ کہاں جائیں گے؟"

مادھو نے پریشان ہو کر کنول کی طرف دیکھا اور اس نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "وہاں پہاڑی کے پیچھے جو بن پور۔"

ایک بوڑھے ملاح نے حیران ہو کر کہا "جو بن پور تو مدت ہوئی اجڑ چکا ہے۔ اب وہاں اونچی ذات والوں کا شہر آباد ہے۔ شاید اس شہر کے اس پاس اچھوتوں کی جو بستی ہیں ان میں سے کسی کا نام جو بن پور ہو۔ میں نے سنا ہے کہ شہر کا سردار بہت اچھا آدمی ہے اور ہماری قوم کے آدمیوں پر جو شہر کے نزدیک بستیوں میں رہتے ہیں کوئی ظلم نہیں کرتا۔ انہیں ہماری طرح صرف شہر کے مندروں اور کنوؤں پر جانے کی اجازت نہیں ورنہ وہ ہر طرح آزاد ہیں۔ شروع شروع میں ان لوگوں پر بہت ظلم ہوتا تھا۔ راجہ کا سینہ پاتی گنگارام اور اس کا بھائی جے رام بہت ظالم تھے۔"

گنگارام کا نام سن کر کنول کو تصور میں چاروں طرف غول کی ندیاں اور آگ کے شعلے دکھائی دینے لگے۔ اسے جلتے ہوئے جھونپڑوں کے درمیان لڑنا باب خاک و غول میں تڑپتا دکھائی دیا۔ یواڑی اور قبیلوں کی چیخ پکار سنائی دی۔ سماج کے باغیوں کے خلاف سردار کی بیٹی کے دل میں انتقام کی دہنی نہونی چٹکاریاں سلگ گئیں۔ لیکن ان ہییب مناظر کے درمیان سکھ دیو کی صورت دکھائی دی اور آگ کے شعلے اور تڑپتی ہوئی لاشیں آہستہ آہستہ اس کی نگاہوں سے اوجھل اور زخمیوں کی چیخ بکا کا شور اس کے کانوں سے محو ہوتا گیا۔ وہ صرف سکھ دیو کو دیکھ رہی تھی اس کی پیاری اور میٹھی دلکش آواز سن رہی تھی۔ وہ چند قدم آگے بڑھ کر ویا کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

بدھو دیر تک ملاحوں سے باتیں کرتا رہا واپس لوٹتے وقت انہوں نے

کنول سے رسمی الوداع کی خواہش ظاہر کی لیکن بدھونے اشلے سے منع کر دیا۔  
ملاح اپنی اپنی کشتیوں پر بیٹھ کر چل پڑے۔ بدھو کچھ دیر خاموش کھڑا دیریا کی  
طرف دیکھتا رہا۔ شانتا اور مادھو بھی ایسے موقعوں پر خاموش رہنا سیکھ چکے تھے۔  
اور وہ جیران ہو کر بدھو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بالآخر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا  
ہوا کنول کے قریب پہنچا۔

”ہن! ہن! کنول! اس نے معصوم آواز میں کہا۔

کنول سر اٹھا کر بدھو کی طرف متوجہ ہوئی۔ سردار کی بیٹی کے دل میں انتقام  
کی چنگاریاں غم کے آنسوؤں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔

بدھونے کہا: ”ہن کنول! ہم وہاں نہیں جائیں گے۔“

کنول نے ملتچی نگاہوں سے بدھو کی طرف دیکھا اور کہا: ”بھیا! صرف ایک  
باب مجھے وہاں لے چلو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ وہاں ٹھہرنے کے لیے ضد نہیں کروں گی  
میں صرف دوسرے اپنا اجر اٹھاؤں گا۔ دیکھ کر واپس چلی آؤں گی۔ اور بھیا! کیا یہ نہیں  
ہو سکتا کہ اپنی قوم کے دوسرے آدمیوں کی طرح ہمیں شہر کے آس پاس رہنے کیلئے  
کوئی جگہ مل جائے؟“

بدھونے جواب دیا کہ ”اگر راجہ کے آدمیوں کو یہ علم ہو گیا کہ تم سردار کی لڑکی  
ہو تو پھر ان بچوں کا کیا حال ہو گا؟“

”نہیں بھیا! اب مجھے کون پہچانے گا۔ ان ملاحوں میں ایک ہماری بستی کا  
آدمی تھا اسے میرے متعلق شک بھی نہیں ہوا۔ اب تو اگر تمہارا بھائی بھی اگر مجھے اس  
حال میں دیکھے تو وہ بھی شاید پہچان نہ سکے۔“

بدھونے کہا: ”اچھا ہن! جیسے تمہاری مرضی۔ جو بن پورا بکتنی دور ہو گا؟“

”اس ٹیلے سے پرے یہاں ہے کوئی تین کوس۔“

”تو پھر وہاں پہنچ رہی ہیں گزار لیتے ہیں۔“ بدھونے کہا۔

مادھونے کہا: ”آؤ چچا! اور یا میں نہ آئیں!“

بدھونے کہا: ”نہیں! انہیں!! اس کنالے پانی تیز ہے۔“ لیکن مادھونے پر  
فقرہ سننے سے پہلے بھاگ کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔

بے وقوف! کنالے سے دُور نہ جانا! یہ کہہ کر بدھو بھی پانی میں کود پڑا۔  
مادھونے ہنستے ہوئے غوطہ لگا دیا۔

(۴)

غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے یہ قافلہ ایک ٹیلے پر چڑھ رہا تھا۔ کنول سب  
سے آگے تھی۔ شانتا ایک گدھے پر سوار تھی اور بدھو اور مادھو سب سے پیچھے  
موشیوں کو بانٹ رہے تھے۔

دل کی دھڑکن کے ساتھ کنول کی رفتار کبھی تیز اور کبھی سست ہو رہی  
تھی اس کی زندگی کے ہر افاق پر تاریک گھٹاؤں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مایوسی ایک  
ناقابل تردید حقیقت بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ دلوں، حوصلوں اور امنگوں  
کی دنیا اُجڑ چکی تھی۔ امید کا ہر نخلستان یاس کے صحرا کی بھیانک وسعتوں نے  
چھپایا تھا۔ تاہم ایک دم — ایک جنون جو ایک انسان کے دل میں عقل و  
شعور کے اعتراف شکست کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اسے ہر ٹھوکر کے بعد اٹھنے  
اور اٹھ کر آگے بڑھنے کا سہارا دے رہا تھا۔

توہمات کے حسین پردوں میں حقیقت کا بھیانک چہرہ چھپانے کی کوشش  
کر رہی تھی وہ اپنے ماحول کی تاریکی میں عقل و شعور کی مشعل کا سہارا چھوڑ کر موہوم

امیدوں کی چراغ روشن کر رہی تھی۔ ایک فریب خوردہ بچے کی طرح وہ تمام دنیا کو جھٹلاتی تھی کبھی کبھی ماضی کے تمام واقعات اسے وہم نظر آتے اور وہ اپنے دل کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتی کہ اس کے آباؤ اجداد کی بستی اجڑی نہیں بلکہ اسی طرح آباد ہے۔ سکھ یوزندہ ہے اور بستی کے باہر جھیل کے کنارے اس کا انتظار کر رہا ہے وہ اسے دیکھتے ہی بھاگ کر اس سے لپٹ جائے گا اور پوچھے گا: "کنول! تم کہاں تھیں؟ وہ یہ کہے گی۔ سکھ یوزندہ ہے مجھے بہت رُلا یا۔ اس کے دل کی دھڑکن کے ساتھ اس کے پاؤں کی رفتار بھی تیز ہو جاتی لیکن موبہوم امیدوں کے چراغ کچھ دیر ٹٹمانے کے بعد بجھ جاتے اس کارہاسا شعور اپنے بے رحم ہاتھوں سے حقیقتوں کے مخموس چہرے سے توہمات کے حسین نقاب اٹھا دیتا۔ اس کے دل کی دھڑکن مدھم اور پاؤں کی رفتار سست پڑ جاتی۔

لیکن اس کے دل میں پھر ایک نیا تو عمل شروع ہوتا اور وہ وہم اور شعور کے طے جملے جذبات کے ساتھ ایک نیا دنیا پیدا کرتی اور اپنے دل سے کہتی کہ وہ مر چکے ہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ مردے پھر زندہ ہو چکے ہوں۔ سکھ یوزندہ اس کی تلاش میں کسی دوسرے راستے جو بن پور پہنچ چکا ہو اور اس کے باپ کے ساتھ دریا کے کنارے کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہو۔ اس کی قوم کے مردوں نے زندہ ہو کر اس کے آباؤ اجداد کی سرزمین سے سماج کے حملہ آوروں کو مار بھگایا ہوا اور انہی ذات والوں کے عملات پھر شودروں کے جھونپڑوں میں تبدیل ہو چکے ہوں؟ سورج کی شعاعوں کا جال مغرب کی طرف سمٹ رہا تھا۔ افق پر مٹیالے رنگ کے بادل کا ایک ٹکڑا ابتدیج سرخ ہو رہا تھا مشرق کی طرف کانگڑے کے بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر چمکتی ہوئی برف سونے کے انبار نظر آنے لگی اور شفق کی بڑھتی ہوئی سرخی کی بدولت یہ سنہری انبار یا قوت کے پہاڑ دکھائی دینے لگے۔

کنول پہاڑی کی چوٹی پر کھڑی اپنے بدلے ہوئے گھر کا نقشہ دیکھ رہی تھی اس پاس کے ٹیلے اور ان پر درخت اسی طرح کھڑے تھے۔ دریا اسی طرح بہہ رہا تھا۔ نیچے جھیل کے پُرسکون اور شفاف پانی میں درختوں کے سائے اسی طرح نظر آ رہے تھے۔ لیکن وہ چھوٹی سی بستی جس کا تصور کنول کے لیے ان منظر سے کہیں زیادہ دل فریب تھا اب ایک خوش نا شہر بن چکی تھی۔ کنول اپنے دوستے ہوئے دل کو دونوں ہاتھوں کا سہارا لے کر اس عالی شان محل کی طرف دیکھ رہی تھی جس کی بنیاد کے نیچے اس کے آباؤ اجداد کے گھر کی راکھ دفن تھی۔ شہر کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں اس بات کا ثبوت تھے کہ یہی تھیں کہ سماج کے باغیوں میں سے بعض پُر امن شودر بن چکے ہیں۔

مالیوسی اور بے کسی کے سمندر کی انتہا گہرائی میں غوطہ لگانے کے بعد اپنے دل سے کنول کا پہلا سوال یہ تھا: "میں یہاں کیوں آئی؟ اس نے بدھو، مادھو اور شاننا کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو اند آئے۔ کنول نے اپنے چہرے کو پھٹی ہوئی چادر میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شاننا گھر اکراں کے ساتھ لپٹ گئی اور سسکیاں لینے لگی۔ مادھو ایسے موقعوں پر بدھو کی تقلید کرنے کا عادی تھا لیکن اس دفعہ وہ بھی زیادہ دیر ضبط سے کام نہ لے سکا اور آنسو بہانے لگا۔ بچوں کو روتا دیکھ کر ماتا کنول کی تمام حسیات پر غالب آ گئی۔ اس نے آنسو پر ننھے بچوں کو کیے بعد دیگرے گلے لگایا اور بدھو کی طرف دیکھ کر کہنے لگی: "بھیا چیلو!"

بدھو نے کہا: "اب کہاں جائیں بہن؟"

"چلو اس شہر کے باہر کہیں ہم بھی ڈیرہ جالیں گے۔ اب رات ہو رہی ہے اگر تم نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا تو کل کہیں اور چلے جائیں گے۔"

مادھونے کہا: چچا! چلو مجھے پائیں لگ رہی ہے۔

بیٹے نے نیچے اترنے کے بعد اچھوتوں کی ایک چھوٹی سی بستی کے کتوں نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ اس فافلے کا خیسہ مقدم کیا۔ چند مرد، عورتیں اور بچے کتوں کی چیخ پکار سن کر گھروں سے نکلے اور بدھو اور کنول نے طرح طرح کے سوال کرنے لگے: کہاں سے آئے ہو؟ کون ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ رات یہاں کیوں نہیں ٹھہرتے؟

کنول خاموش تھی۔ بدھونے بھی کسی سوال کا جواب نہ دیا اور گدھوں کو ہانکتا اور کتوں کو گالیاں دیتا ہوا بستی سے باہر نکل آیا۔ کنول کی خواہش پر اس نے جھیل کے قریب چند گھنے درختوں کے درمیان گدھے روک لیے اور سامان اتارنے لگا۔

(۵)

ادھی رات کے وقت بدھو، شانتا اور مادھو شبنم سے بھیگی ہوئی گھاس پر پھٹے پرانے بستر بچھاتے گری نیند سو رہے تھے۔ کنول کئی بار کروٹیں بدل کر سونے کی ناکام کوشش کے بعد آسمان کے جگمگاتے ستاروں کو دیکھنے لگی۔ مشرق میں ایک ٹیلے کے عتب سے چاند نمودار ہوا اور ستاروں کی چمک ماند پڑنے لگی۔ کنول کو اچانک ایک خیال آیا اور وہ اٹھ کر جھیل کی طرف چلی دی۔

جھیل میں جا بجا کنول کے پھول نکلتے ہوئے تھے چمکتے ہوئے جگنو فضا میں قس کر رہے تھے۔ کنول اپنی ابتدائی زندگی میں ہزاروں بار یہ مناظر دیکھ چکی تھی لیکن اب ان میں وہ دل کشی نام کو نہ تھی۔ بچپن میں وہ ان تمام چیزوں کو اپنی زندگی کا ایک جزو خیال کرتی تھی جو جگنوؤں کے پیچھے بھاگنے اور کنول کے پھولوں کو توڑ کر ان کی تکیاں

بچہ نے میں ایک لطف آتا تھا وہ ٹیلوں اور راویوں میں گھومتے اور جھیل میں تیرتے ہوئے خوش ہوتی تھی۔ پھر سکھ دیو آیا اور اس نے کنول کے زمین و آسمان میں ایک نیا رنگ بھر دیا۔ اور اسے دنیا کی ہر حسین شے سکھ دیو کی کسی نہ کسی خوبی کا مظہر نظر آنے لگی۔ اسے بہاؤں میں سکھ دیو کی عظمت، چاند میں اس کی دل فریبی، سورج میں اس کا جاہ و جلال، ستاروں میں اس کی مسکراہٹیں اور کنول کے پھولوں میں اس کی پاکیزگی نظر آتی۔ لیکن سکھ دیو کی موت کے بعد قدرت کا حسین چہرہ اس کی نگاہوں میں مسخ ہو چکا تھا اور زندگی کے میٹھے راگ تلخ ہو چکے تھے۔

کنول جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ ایک ٹیلے کے قریب اسے ام کے درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیا وہ رکی، جھکی اور پھر بھاگ کر ایک درخت کے ساتھ لپٹ گئی۔ یہ ان آدمی کی بوٹی ہوئی گٹھلیاں تھیں جنہیں سکھ دیو نے کھایا تھا۔

کنول نے درد بھری آواز میں کہا: سکھ دیو! ہماری محبت کے پودے اب تناور درخت بن چکے ہیں۔ سکھ دیو! تم کہاں ہو؟ خاموش کائنات کنول کے اس سوال کا جواب دے سکی اور وہ خیالات کی دنیا میں گھو گئی۔ سکھ دیو اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ چار بائی پر پڑے ہوئے آدمی کے دھیر کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی۔ کھانے کی چیز کھالینے میں کیا ہرج ہے۔ آپ شاید پرسوں تک دریا عبور نہ کر سکیں۔ شاید چند دن اور یہیں رہیں اتنے دن بغیر کچھ کھائے۔۔۔۔۔

چہرہ جب وہ اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودوں میں سے گھاس اکھاڑ رہی تھی وہ ٹیلے سے اتر کر اس کے پاس آکھڑا ہوا تھا۔ کنول دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ رہی تھی: یہ ام اس دن آپ نے کھائے تھے۔ میں نے گٹھلیاں لا کر اس جگہ بویں۔ یہ تمام آگ آتی ہیں۔

اچانک آم کے درخت پر سے اٹو کی خوفناک آواز سنائی دی اور کنول کے  
تصورات کی حسین دنیا درہم برہم ہو گئی اسے بچوں کا خیال آیا اور وہ تیزی سے قدم  
اٹھاتی ہوئی واپس چل دی۔

علی الصباح جب بدھو اٹھ کر جھیل میں نہانے کا ارادہ کر رہا تھا اسے کنول  
کی آواز سنائی دی۔ وہ بچوں کے قریب لیٹی ہوئی گہری نیند میں کمر رہی تھی میں یہیں ہوں  
گی۔ یہ میرا وطن ہے میرے بچوں کا وطن ہے۔ میں یہیں رہوں گی۔ یہیں رہوں گی۔  
بدھو کچھ دیر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا سوچتا رہا بالآخر وہ انگڑائی لے کر  
اٹھا اور مادھو کو جھجھوڑ کر جگانے لگا۔ مادھو آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔

بدھو نے کہا "چلو نہائیں۔"

نہانے کی دعوت پر مادھو کی نام سستی کا فور ہو گئی اور وہ خوشی سے اچھلتا  
کوٹنا بدھو کے آگے آگے چل دیا۔

بدھو نے کہا "پہلے کون پہنچے گا؟"

مادھو میں نہیں "کھتا ہوا، ہنستا ہوا بھاگا اور جھیل میں کود کر غوطے

لگانے لگا۔

اسی دن بدھو پڑوس کے شوروروں کی مدد سے سرکنڈے کا جھونپڑا تعمیر کر رہا  
تھا۔ شوروروں کی زبانی اسے معلوم ہو چکا تھا کہ شہر والے آدھ کوئس کے ناصلے کو دھرم  
کی حفاظت کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ جھیل کے دوسرے کنارے شہر کا بڑا مندر تھا  
لیکن شہر کی طرح یہ مندر بھی کافی ناصلے پر تھا۔ بدھو کو شوروروں کی زبانی یہ بھی معلوم  
ہوا کہ اس شہر کا سردار راجہ کے دوسرے سرداروں سے بہت مختلف ہے اگر  
اسے معلوم ہو جائے کہ کسی راجہ کے کسی سپاہی نے کسی شورور کے ساتھ بلاوجہ سختی  
کی ہے تو وہ اسے سخت سزا دیتا ہے۔

دن، ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ وقت کا مہم اگرچہ  
کنول کے نہ مٹنے والے زخموں کا مداوا نہ بن سکا۔ تاہم درد کی شدت آہستہ آہستہ  
کم ہوتی گئی۔ مرنے والے شوہر کی محبت اس کی زندہ نشانیوں کی طرف منطقت ہونے  
لگی۔ بیوہ کی مایوسیاں ایک ماں کی انگلیوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ بدھو کا دن،  
بھڑوں اور بکریوں کے پیچھے گھٹنے اور بڑھتے ہوئے سائے ناپنے میں گزر جاتا  
وہ شام کو تھکا ہوا آتا اور کھانا کھا کر سو جاتا۔ اور اگر مادھو اور شانا اصرار کرتے تو  
پڑپڑوں اور بھوتوں کی کوئی کہانی سناتے بیٹھ جاتا۔ اس پاس کی بستریوں کے  
چرواہوں سے وہ سماج کے دیوتاؤں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ لیکن دیوتا کے  
معنی اس کے لیے مٹی کی ایک بھیناٹک مورتی کے سوا کچھ نہ تھے۔ پہاڑی قوم کے  
ہر چرواہے کی زبان سے دیوتا کا لفظ سن کر وہ یہی سمجھتا کہ کوئی رامو اسے بے وقوف  
ناچکا ہے۔

دس مہینوں میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ برسات کا پہلا مہینہ مادھو  
اور شانا کے لیے انتہائی مسرت کا مہینہ تھا۔ وہ دن بھر جھیل میں نہاتے اور شام  
کے وقت کسی ٹیلے پر چڑھ کر دیہاتی روائی کا منظر دیکھتے۔

## نٹھے چجاری

رات بھر بارش ہونے کی وجہ سے صبح کے وقت بلکی بلکی بریلیاں ایک لٹے ہوئے قافلے کی طرح منتشر ہو کر مغرب کا رخ کر رہی تھیں۔ دور سے مندر کی گھنٹی کی آواز آرہی تھی۔ پتھر کے ایک مکان کے کشادہ صحن میں آم کے ایک درخت کے نیچے چند گائیں کھڑی تھیں۔ برآمدے میں ایک کمسن لڑکی بستر سے انگڑائی لے کر ابھی اودا سنبھلیں نکلتے ہوئے بولی: "ماتا! ماتا!!"

"بیٹی! میں دودھ دوس رہی ہوں۔"

"لڑکی نے صحن میں آکر پوچھا: "ماتا! پتا جی چلے گئے ہیں؟"

ماں نے جواب دیا: "بیٹی! وہ تو دیر کے مندر جا پہنچے ہوں گے۔" لڑکی نے بگڑ کر کہا: "مجھے ساتھ کیوں نہیں لے گئے۔ میں نے رات کے وقت آپ سے کہا نہیں تھا کہ مجھے بھی ان کے ساتھ ہی جگا دینا۔"

ماں نے دلاسا دیتے ہوئے جواب دیا: "بیٹی! وہ بہت سویرے اٹھے تھے اور جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ موہنا کو دن چڑھے ناشتہ کروا کر بھیج دینا۔ اب تم ہاتھ منہ دھو کر دودھ پی لو۔ شاید رندھیر آجلے اس کے ساتھ چلی جانا۔"

موہنی پانی کا کٹورا سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ اور ابھی منہ دھونے کا ارادہ کر رہی تھی کہ رندھیر بھاگتا ہوا اندر آیا اور اس نے ہانپتے ہوئے کہا: "چلو موہنا! جھیل کی طرف چلیں۔ وہاں سے کنول کے پھول لائیں گے۔ رام۔ سروپ۔ اندر آؤ۔"

لچھئی جا چکے ہیں۔"

موہنی کی ماں بولی: "دیکھو رندھیر! اگر جانا ہے تو مندر جاؤ ورنہ موہنی کو یہیں بٹھتے دو۔"

موہنی منہ پر پانی کے پھینٹے مارتی ہوئی بولی: "ماتا! ہم جھیل سے جوتے جوتے مندر جائیں گے۔ تمہارے لیے کنول کے پھول لاؤں گی۔"

ماں نے بگڑ کر کہا: "بھاڑ میں جائیں تمہارے پھول۔ کہیں پانی میں ڈب جاؤ گی۔"

"نہیں ماتا! پھول تو رندھیر توڑے گا میں تو پانی کے نزدیک بھی نہیں جاؤں گی۔"

"اچھا بیٹا رندھیر! اس کا خیال رکھنا۔ لو بیٹی۔ دودھ پی لو۔"

موہنی نے پیتل کا ایک کٹورا اٹھایا اور ماں کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ماں نے کٹورا بھر دیا تو وہ جیسے پاؤں رندھیر کے پاس آئی اودا ہستہ سے بولی: "لو جلدی کرو!"

"یہ پی آیا ہوں۔" رندھیر نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"اول ہوں! یہ پینا پڑے گا ورنہ میں نہیں جاؤں گی۔"

رندھیر نے مسکراتے ہوئے کٹورا لیا اور دودھ پی کر واپس کر دیا۔ موہنی پھر بھاگ کر ماں کے پاس پہنچی اور کہنے لگی: "ماتا! آج دو پیوں گی۔ ماں نے مڑ کر رندھیر کی طرف دیکھا وہ ہنس پڑا اور اس نے مسکراتے ہوئے کٹورا بھر دیا۔ موہنی نے دودھ پی کر کٹورا برآمدے میں رکھ دیا اور رندھیر کے ساتھ چل دی۔ ماں نے پیچھے سے آواز دی: "بیٹی! دیر نہ لگانا!"

"نہیں بہت جلد آ جاؤں گی۔"

موتہنی اس خیال سے کہ شاید ماں واپس نہ بلا لے۔ رندھیر کے آگے آگے بھاگنے لگی۔

رندھیر کی عمر قریباً دس سال تھی اور موتہنی اس سے دو سال چھٹی تھی موتہنی کی ماں کا نام ساوتری تھا۔ رندھیر اس شہر کے سردار کا لڑکا تھا اور اس کی ماں مرچکی تھی۔

جھیل کے کنارے ان بچوں کے ساتھی ایک اجنبی لڑکی کے پاس کھڑے ایک لڑکے کی طرف دیکھ رہے تھے جو جھیل کے گہرے پانی میں غوطے لگا رہا تھا۔ تیرنے والے لڑکے نے ان سب کو دعوایا طلب کیا۔ وہ دیکھ کر کہا: "شاننا! دیکھو میں نیچے سے مٹی لاتا ہوں۔"

شاننا کو ان بچوں کے صاف ستھرے لباس نے مرعوب کر دیا تھا وہ پریشان ہو کر کھانے کی طرف بڑھی اور کہنے لگی: "چلو مادھو! گھر چلیں۔ ماما انتظا رکرتی ہوں گی۔"

"ابھی آیا" مادھو نے یہ کہہ کر غوطہ لگا دیا۔ بچے چند لمحے پریشان کھڑے رہے۔ موتہنی دیر تک ضبط نہ کر سکی۔ اس نے ملتی ننگا ہوں سے رندھیر کی طرف دیکھا اور کہنے لگی: "رندھیر! وہ بیچارا ڈوب گیا اسے نکال لاؤ نا!"

رندھیر نے جلدی تھ کر تار کر پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ ابھی گہرے پانی میں نہ پہنچا تھا کہ مادھو نے کنارے کے پاس آکر سر نکالا اور شاننا کی طرف ایک سیدپ پھینکے ہوئے بولا: "یہ لور۔"

"آہا سیدپ!" موتہنی نے شاننا کے پاس آتے ہوئے کہا۔

"تم لوگی؟" شاننا نے یہ کہہ کر سیدپ اس کی طرف بڑھا دیا۔

موتہنی نے سیدپ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا: "وہ تمہارا بھائی

بھائی؟"

"ہاں!"

"میں بھی سیدپ لاؤنا! لپٹھی نے مادھو سے مخاطب ہو کر کہا:

"اچھا! تمہیں بھی لا دیتا ہوں۔"

مادھو نے چند بار پانی میں غوطے لگائے اور ہر ایک کو ایک سیدپ لا دیا۔

رندھیر نے بھی سیدپ حاصل کرتے کے لیے چند بار غوطے لگائے لیکن اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

مادھو نے پوچھا: "تمہیں بھی لا دوں؟"

رندھیر نے جواب دیا: "نہیں میں خود نکالوں گا۔"

رام سروپ اور اندر کنارے کے کم گہرے پانی میں اتر کر کنول کے پھول توڑنے لگے۔ موتہنی نے پانی میں اترنے کی بجائے کنارے سے ہاتھ بڑھا کر ایک پھول توڑنے کی کوشش کی لیکن پاؤں پھسلا اور وہ دھم سے پانی میں گر پڑی۔ باقی تمام بچوں نے قہقہہ لگایا۔ رندھیر اس کی مدد کے لیے بڑھا لیکن وہ اس کے پہنچنے سے پہلے اٹھ بیٹھی اور کچھ دیر نہ بسورنے کے بعد بچوں کی ہنسی میں شریک ہو گئی۔ مادھو نے گہرے پانی سے کنول کے چند بڑے بڑے پھول توڑے اور جھیل سے باہر نکل کر جھکتے ہوئے موتہنی کو پیش کر دیے۔

موتہنی نے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے پھول لے لیے۔ مادھو نے پوچھا:

"اور لا دوں؟"

موتہنی نے جواب دیا: "نہیں یہ بہت ہیں۔"

مادھو کو اب بھوک محسوس ہو رہی تھی لیکن ان بچوں کو چھوڑ کر اس کا گھر جانے کو جی نہ چاہا اس نے پھر جھیل میں چھلانگ لگا دی۔ اور رندھیر کے پاس جا کر کہا:

میں غوط لگاتا ہوں تم پکڑو گے؟  
ہاں!

ماوھو نے غوط لگایا۔ رندھیر نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ بہت  
دور جا نکلا اس کے بعد رندھیر نے غوط لگایا لیکن ماوھو نے اسے پکڑ لیا۔ ماوھو  
اور رندھیر دیکھ اس کھیل میں مصروف ہے۔ موہنی نے کئی آوازیں دیں لیکن رندھیر  
اس نئی دل چسپی میں مندر کی طرف جانے یا گھر لوٹنے کا خیال چھوڑ چکا تھا۔ باقی  
بچے اپنے اپنے گھر جا چکے تھے۔ موہنی رندھیر کی بے توجہی سے تنگ آ کر شانتی سے  
اس نے شانتی کے قریب گھاس پر بیٹھے ہوئے پوچھا: تم بھی تیسرا  
جانتی ہو؟

ہاں اور تم؟  
مجھے گھر سے پانی سے ڈر لگتا ہے۔  
شانتی نے پوچھا: تم شہر سے آئی ہو؟  
ہاں — اور تم؟  
ہم یہیں رہتے ہیں۔ جھیل کے کنارے۔  
تم نے شہر دیکھا ہے؟  
نہیں! چچا بھوکتا ہے شہر کے دیوتا انسانوں کو کھا جاتے ہیں۔  
پگلی! وہ تو ہماری حفاظت کرتے ہیں۔  
بھلا تم نے دیوتا دیکھے ہیں؟  
نہیں تو ہر روز دیکھتی ہوں تم بھی دیکھو گی؟  
کہاں؟

مند میں۔

مند میں؟ میں وہاں نہ جاؤں گی۔

کیوں؟

مجھے ڈر لگتا ہے۔

پگلی! بھلا لوگ دیوتاؤں سے بھی ڈر کرتے ہیں؟

تمہیں ان سے ڈر نہیں لگتا؟

نہیں تو۔

اگر وہ تمہیں پکڑ کر کھا جائیں تو؟

یہ تمہیں کس نے بتایا کہ دیوتا لوگوں کو کھا جاتے ہیں؟

چچا بھوٹے۔

وہ کون ہے؟

میرا چچا۔

وہ کوئی جھنگلی ہو گا۔

جھنگلی کیا ہوتا ہے؟

جھنگلی وہ ہوتا ہے جس نے شہر دیکھا ہو۔

تو پھر ہم سب جھنگلی ہیں۔ ہم میں سے کسی نے شہر نہیں دیکھا۔ بھلا شہر کے

لوگ جھنگلی کے لوگوں کو مارتے ہیں؟

نہیں تو۔

شانتی شہر کے متعلق کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی لیکن ماوھو اور رندھیر نے جھیل

سے نکل کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔

ماوھو نے رندھیر سے سوال کیا: کل تم یہاں آؤ گے؟

زندھیر نے جواب دیا: "اؤں گا۔"

"تم بھری بجانا جاتے ہو؟"

"نہیں! تم؟"

"میں جانتا ہوں۔ مٹھو! میں نہیں سستاتا ہوں۔"

مادھو کا گرتے ایک درخت کی ٹہنی کے ساتھ لٹک رہا تھا اس نے آگے بڑھ کر جیسے بھری نکالی اور اسے ہونٹوں سے لگا کر مسکراتی ہوئی نگاہوں سے موہنی اور زندھیر کی طرف دیکھتے لگا۔

موہنی نے کہا: "چلو زندھیر! گھر چلیں۔"

مادھو نے اپنا کمال دکھانے کا موقع کھونا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی انگلیاں بھری پر پھرنے لگیں اور فضا میں بھیرویں کا دل کش نعشہ گونجنے لگا۔

زندھیر اور موہنی کے کان موسیقی کی لطافتوں سے نا آشنا نہ تھے۔ بھری کی لئے انہیں معمولی سے زیادہ خوش گوار معلوم ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ بھری بجانے والا ان کا ہم عمر تھا۔ وہ ایک دوسرے کے تاثرات کا اندازہ کرنے کے لیے بار بار ایک دوسرے کی طرف دیکھتے۔ زندھیر کی آنکھیں زبان حال سے کہہ رہی تھیں۔ دیکھا تم نے گھر جانے کی رٹ لگا رکھی تھی اور موہنی کی نگاہیں اس کا جواب دے رہی تھیں۔ کاش! تم بھی اسی طرح بھری بجا سکتے۔

مادھو نے یہ فہم نہ کیا اور فضا میں خاموشی اور اداسی چھا گئی۔ زندھیر اور موہنی ایک گہری دل چسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

شاننا درخت کی ٹہنی سے کرتا تار لائی اور مادھو کو دیتے ہوئے بولی: "اب کرتے پہنؤ! گھر چلیں۔"

زندھیر نے جواب دیا: "ہم کل پھر آئیں گے۔ تم بھی آؤ گے نا؟"

"اؤں گا۔" مادھو نے کرتے پہنتے ہوئے کہا۔

زندھیر کپڑے پہن کر موہنی کے ساتھ ہویا لیکن چند قدم چل کر واپس مڑا اور مادھو سے پوچھنے لگا۔ تم کہاں جاؤ گے؟

"ہم جھیل کے اس طرف رہتے ہیں۔"

"میں کل بھری لاؤں گا مجھے سکھا دو گے؟"

"سکھا دوں گا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"مادھو اور تمہارا؟"

"زندھیر۔ اس نے جواب دیا۔"

"اور تمہارا؟" — "مادھو نے موہنی سے پوچھا۔"

"میرا نام موہنی ہے۔"

"تم بگلے کے بچے دیکھو گی؟"

"ہاں وہ کہاں ہیں؟"

"تم انہیں مارو گی تو نہیں؟"

"نہیں ماروں گی۔"

"اچھا چلو! تمہیں دکھاتا ہوں۔"

شاننا کا بیٹا صبر لبریز ہو چکا تھا اس نے کہا: "میں بگلے کے بچے دیکھ چکی ہوں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں گھر جاؤں گی۔"

"اچھا تم جاؤ۔"

شاننا جھونپڑی کی طرف چل دی۔

زندہ ہونے کہا: "چلو موتی! پیچھو دیکھیں گے۔"  
 "نہیں! میں ابھی دیکھوں گی جب تم نہاں سے تھے۔ میری بات بھی نہیں سنتے تھے۔ اب میں ہلکے کے بچے دیکھنا چاہتی ہوں تو تم بھاگنا چاہتے ہو!"  
 "اچھا بھئی چلو!"

اندھیر اور موتی مادھو کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔  
 چند قدم چل کر مادھو ایک درخت کے اوپر چڑھا اور اس نے ایک گونسلے میں سے ہلکے کے دو بچے اتار کر زندہ ہیر اور موتی کے سامنے رکھ دیئے۔

موتی نے پوچھا: "یہ جو بچے کیوں کھولتے ہیں؟"  
 مادھو نے جواب دیا: "انہیں بھوک لگ رہی ہے۔"  
 موتی نے کہا: "نہیں تم غلط کہتے ہو۔ یہ بھگوان جی کا نام چلتے ہیں۔"  
 "بھگوان جی! وہ کیا ہوتا ہے؟"  
 "موتی نے حیران ہو کر جواب دیا: "اُول ہوں، تمہیں بھگوان جی کا پتہ نہیں؟"

بھگوان جی نے تو ہمیں بنایا ہے۔"  
 مادھو نے سوال کیا: "تمہیں بھگوان جی نے بنایا ہے؟"  
 "ہاں۔"  
 "اور مجھے؟"  
 "تمہیں بھی اسی نے بنایا ہے۔"

"اور ان بچوں کو؟"  
 "یہ بھی بھگوان جی نے بنائے ہیں۔ پتا جی کہتے تھے کہ سب چیزیں بھگوان جی نے بنائی ہیں۔"

مادھو نے پریشان ہو کر سوال کیا: "وہ بھگوان جی کہاں ہے؟"

"تم نے ابھی تک بھگوان جی کو نہیں دیکھا۔"

مادھو نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا: "نہیں!"

"وہ مندر میں ہیں۔ ہم انہیں ہر روز دیکھا کرتے ہیں۔ تم بھی دیکھو گے؟"

"لیکن چچا بدھ تو یہ کہتا تھا کہ مندر میں شہر کے لوگ بچوں کو کھا جاتے ہیں۔"

"وہ تمہیں یونہی ڈراتا ہوگا۔ چلو زندہ ہیر اسے مندر دیکھا لائیں۔"

"لیکن وہ رہو جائے گی۔"

"نہیں ہم جلدی سے لوٹ آئیں گے۔"

(۲)

مادھو خوف، تشویش اور تذبذب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ موتی اور زندہ ہیر کے ساتھ مندر کی طرف چل دیا۔ مادھو نے اسے اور شاننا کو مندر کے متعلق نہ اڑوں خوفناک باتیں سنائی تھیں لیکن موتی نے یہ کہہ کر وہ تمہیں ڈراتا ہوگا اس کے اکثر توہمات دور کر دیئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چچا بدھ اسے اکثر ڈرایا کرتا تھا۔ جب وہ بہت چھوٹا تھا تو وہ اسے یہ کہہ کر درختوں پر چڑھنے سے منع کیا کرتا تھا کہ وہاں چڑیاں رہتی ہیں لیکن اب وہ اونچے سے اونچے درخت پر چڑھ سکتا تھا اور کسی چڑیا نے اسے نیچے نہ گرایا۔ جب وہ ذرا بڑا ہوا تو بدھ جو حیل میں جانے سے روکنے کے لیے یہ کہا کرتا تھا کہ وہاں مگر چھوٹے ہیں لیکن اب وہ گہرے پانی میں تیرتا ہے اور مگر مجھ اسے کھانے کے لیے نہیں دوڑتے۔ مندر میں اگر کوئی ڈرانے والی چیز ہوتی تو زندہ ہیر اور موتی کو کیوں نہ ڈراتی۔

مادھو اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ بدھو چچا مجھے درختوں سے اس لیے ڈراتا تھا

کہیں گرنہ پڑوں۔ پانی سے اس لیے ڈراتا تھا کہ میں ڈوب دوں اور مندر سے شاید اس لیے ڈراتا ہے کہ میں راستہ نہ بھول جاؤں۔ اور شہر۔۔۔ شہر کے متعلق بھی تو وہ مجھے ڈرایا کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ شہر کے متعلق بھی اس نے جھوٹ بولا ہو اگر شہر کے لوگ بچے کھانے والے ہوتے تو رندھیر اور موہنی اور دوسرے بچوں کو کیوں چھوڑتے۔ چچا جھوٹ بولتا ہے۔ آج میں اسے بتاؤں گا کہ میں مندر دیکھ آیا ہوں اور تم شہر کے متعلق بھی جھوٹ بولتے ہو۔

مادھو کا دل خوشی سے اچھلنے لگا لیکن پھر اس کے دل میں ایک خیال آیا وہ بھگوان کیسا ہر گامندر میں بیٹھ کر یہ سب کچھ کس طرح بناتا ہو گا؟ اس کے دماغ میں بھگوان کی کوئی خیالی تصویر نہ آسکی۔ بہر صورت اسے یہ اطمینان ہو چکا تھا کہ وہ کوئی خوفناک شے نہ ہو گی۔

مندر سے باہر شکر اور گوپال دوپجاری، آم کے درختوں کی گھنٹی چھاؤں میں سو رہے تھے۔ موہنی اور رندھیر کے ساتھ مادھو اپنے دماغ میں بھگوان کی عجیب و غریب خیالی تصویریں لیے مندر میں داخل ہوا۔ مندر کے وسیع کمرے میں طرح طرح کی مورتیاں دیکھ کر مدیت نشی طاری ہو گئی۔

”مجھے ڈر لگتا ہے“ اس نے والپس مڑتے ہوئے کہا۔

موہنی نے اسے تسلی دی اور کہا ”ڈر کس بات کا؟ یہ سب اچھے دیوتا ہیں“۔  
”دیوتا؟“ اس نے حیران ہو کر سوال کیا۔ تم تو مجھے بھگوان دکھانے کے لیے لائے تھے وہ جس نے ہمیں بنایا ہے۔“

موہنی نے جواب دیا۔ ”وہ دیکھو سب سے اونچے بھگوان جی ہیں اور قریب آکر اچھی طرح دیکھو۔ ڈرتے کیوں ہو؟“

مادھو ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا۔ رندھیر اور موہنی کی ہنسی سے اس کا منہ

بھی آہستہ آہستہ جاتا رہا اور وہ مورتی جس نے تمام دنیا کی چیزوں کے علاوہ کتھولی کے پھول اور موہنی جیسی ولفریب صورتیں بنائی تھیں اسے پیاری نظر آتے لگی۔ وہ ذرا اور آگے بڑھا اور چند بار کا پتے ہوئے ہاتھوں سے مورتی کو چھونے کے بعد بتے تکلفی سے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا اس نے موہنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”یہ ملتے اور ملتے کیوں نہیں۔ یہ بہت سخت ہیں۔ شاید یہ پتھر کے بنے ہوئے ہیں!“

موہنی نے کہا: ”ایسا دکھو بھگوان جی خفا ہو جائیں گے۔ ان کے سامنے لوگ بھجن گایا کرتے ہیں اور ہم بھی گائیں۔“  
”بھجن کیا ہوتا ہے؟“

”میں بھجن بھی نہیں آتا۔ اچھا ہم گاتے ہیں تم سنو!“  
موہنی اور رندھیر کی شیریں آواز مندر میں گونجنے لگی۔ مادھو چند بار ان کے الفاظ میں دہرانے کے بعد ان کے ساتھ گانے میں شریک ہو گیا۔  
”بھجن کے اختتام پر مادھو نے پوچھا: ”میں بھگوان کے سامنے بفسری بجاؤں؟“  
رندھیر نے جواب دیا: ”بجاؤ!“

مادھو نے ایک دلکش ترانہ شروع کیا۔ مندر سے باہر بفسری کے اونچی سڑوں سے شکر اور گوپال چونک اٹھے۔

گوپال نے کہا: ”اسے شکر اکتی میٹھی آواز ہے؟“  
شکر نے ڈنڈا سنبھال کر اٹھتے ہوئے کہا: ”اے ماے گے۔ ارے یہ وہی اچھوت لونڈا ہے جو بھیل کے کنارے بفسری بجا یا کرتا ہے۔“

شکر مند کی طرف بھاگا اور گوپال اس کے پیچھے ہو گیا۔ انہیں بے تحاشا مندر میں داخل ہونے دیکھ کر مادھو کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بفسری گر پڑی

اور وہ رندھیر کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔  
 مادھو کو دیکھتے ہی شکر نے غضب ناک ہو کر ڈنڈا اٹھایا اور پیشتر اس کے  
 کہ رندھیر اور مومنی اس کے بچاؤ کی کوشش کر سکتے اس کا ڈنڈا مادھو کے سر پر پڑا  
 مادھو تورا کر زمین پر گر ا اور اس کے سر سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ شکر نے دوسری  
 بار ڈنڈا اٹھایا لیکن گوپال نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا: "شکر! یہ  
 بھگوان کا مندر ہے۔ کالی دیوی کا مندر نہیں۔"

رندھیر اگرچہ کم سن تھا لیکن اس کی رگوں میں ایک بہادر کشتی کا خون تھا  
 اور پھر شہر کے سب سے بڑے سردار کے بیٹے کے سامنے ایک معمولی بھاری کی یہ  
 حرکت ایک نئی بات تھی۔

اس نے گرج کر کہا: "تم نے اسے کیوں مارا، اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟"  
 بھاری کو غصے کی حالت میں سردار کے بیٹے کو پہچانتے میں ذرا دیر لگی۔  
 اس نے کہا: "تم اسے لائے تھے یہاں؟"

"ہاں! ہم لائے تھے۔ مجھے گھر پہنچ لینے دو۔ دیکھنا بتا جی تمہارے ساتھ  
 کیا کرتے ہیں۔"

"بے وقوف! تمہارے پتا کو بھی دیکھ لوں گا۔ تم نہیں جانتے۔ یہ ایک چھو  
 ہے اور اسے مندر میں لانا مہاپاپ ہے۔ یہ کہہ کر شکر نے مادھو کو پاؤں سے پکڑا  
 اور گھسیٹتا ہوا مندر سے باہر لے گیا۔ خون کی لکیر بھگوان کی مورتی سے شروع ہوئی  
 سیاہ پتھر کے فرش پر گہرا نشان چھوڑتی ہوئی مندر سے باہر گھاس اور مٹی میں روپوش  
 ہوتی چلی گئی۔"

رندھیر غصے سے کانپتا اور مومنی روتی ہوئی اس کے پیچھے جا رہے تھے۔  
 گوپال رندھیر کو پہچان چکا تھا اور وہ سب سے پیچھے تھا۔ شکر مادھو کو مندر کے

احاطے سے باہر چھوڑ کر گالیاں دیتا ہوا واپس مڑا۔ اس نے رندھیر کی طرف دیکھا  
 اور دھمکانے کے لیے ڈنڈا دکھاتے ہوئے چلایا: "اور تم اسے ساتھ لائے تھے؟"  
 اس عرصہ میں گوپال رندھیر کے پاس پہنچ چکا تھا اس نے رندھیر کے  
 کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "اب تم بھاگ جاؤ۔"

گوپال کے ان الفاظ سے رندھیر کی غیرت نے جوش مارا اس نے جلدی سے  
 نیچے جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور شکر کی طرف سے مارا۔ پتھر نشانے پر لگا اور شکر  
 دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا۔

ایسے معاملات میں گوپال شکر کی نسبت زیادہ آزاد خیال رہتا لیکن شکر  
 سے کسی پرانی رنجش نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے تھے۔ شکر انتہائی غصے  
 کی حالت میں رندھیر کو پہچان نہ سکا۔ اگر وہ گوپال کی طرح ٹھنڈے دماغ سے کام  
 لیتا تو شاید پتھر کھا کر بھی وہی تباہی بکھنے کی بجائے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دینے  
 کی کوشش کرتا کہ یہ پتھر پھینکتے والے ہاتھ کسی معمولی بچے کے ہاتھ نہیں۔ شکر اپنی  
 پیشانی سے خون پونچھتا ہوا اٹھا اور ڈنڈا اٹھا کر زخم خوردہ چپٹے کی طرح رندھیر کی  
 طرف بڑھا لیکن گوپال نے اس کا راستہ روک لیا: "پاگل ہو گئے ہو شکر! جانتے ہو یہ  
 کون ہے؟ اسے یہ سردار رام داس کا بیٹا ہے۔"

گوپال کے ان الفاظ نے شکر کے دماغ میں جلتے ہوئے انگاروں پر برتن کی  
 ڈلی رکھ دی اور وہ ٹھنک کر رہ گیا۔ ڈنڈے کا وہ سرا جوا آسمان کی طرف اٹھ رہا تھا۔  
 زمین کی طرف جھک گیا۔ اس نے خفیف ہو کر کہا: "اچھا میں پروہت کے پاس جاتا  
 ہوں۔ یہ خواہ سردار کا لڑکا ہو یا راجہ کا۔ اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ شودروں کو ساتھ ملا  
 کر ہمارے مندر بھر ہشٹ کرے۔"

گوپال نے کہا: "تمہاری بھاگ دوڑ کا زیادہ سے زیادہ اثر یہ ہوگا کہ ہمیں دریا

سے پانی لا کر سارا مندر دھو دینا پڑے گا۔ شکر! یاد رکھو! پروہت کو پرسوں ہی اس کے باپ نے تین گائیں اور ایک گھوڑا دیا تھا۔ وہ تمام ذمہ داری ہم پر ڈالے گا اور رام داس سے بگاڑنے کی بجائے اس کے لیے مندر میں ہماری جگہ دمنے پجاری رکھ لینا زیادہ آسان ہوگا۔

شکر! کچھ جواب دیئے بغیر رندھیر اور موہنی کو گھوڑا ہوا ایک طرف چل دیا۔ گوپال نے پیچھے سے آواز دے کر پوچھا: "کماں جا رہے ہو؟"

دیر میں اشتان کے لیے۔ تم مندر سے خون صاف کرو۔ گوپال نے جواب دیا: اپنی بلا میرے سر نہ ڈالو۔ تم مندر صاف کرو! تمہاری جگہ اشتان کرتا ہوں۔

گوپال کی طنز نے شکر کی رفتار تیز کر دی۔

موہنی بھاگ کر مادھو کے پاس پہنچ چکی تھی۔ گوپال نے رندھیر سے کہا جاؤ بیٹا! تمہیں معلوم نہیں کہ یہ کتنا بڑا پاپ ہے۔ موہنی کو گھر لے جاؤ۔ وہ بخس شود کے پاس کھڑی کیا دیکھ رہی ہے۔ جاؤ! پروہت آنے والا ہے اور مجھے مندر صاف کرنا ہے ورنہ میں تمہیں گھر چھوڑ آتا۔ کل میرے لیے کھیر لاؤ گے نا؟ رندھیر کچھ جواب دیے بغیر موہنی کی طرف چل پڑا اور گوپال مندر کی طرف لوٹ آیا۔ مادھو نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

رندھیر نے کہا: "موہنی! اس کا خون ابھی بند نہیں ہوا۔ لاؤ کپڑا اس کا زخم بندھ

دول۔"

موہنی نے جلدی سے اپنی اور مہنی اتار کر رندھیر کو دی۔ رندھیر نے اس کا زخم بانڈھا۔ موہنی سسکیاں لیتی اور آنسو پونچھتی ہوئی مادھو کے سامنے بیٹھ گئی۔ "تمہیں بہت درد ہوتا ہوگا؟" اس نے کہا۔

"نہیں!۔" مادھو نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

رندھیر نے پوچھا: تمہارا گھر کس طرف ہے؟ چلو تمہیں چھوڑ آئیں۔

موہنی نے تسلی دیتے ہوئے کہا: تم فکر نہ کرو! رندھیر نے تمہارا بدلہ لے لیا ہے اتنا بڑا پتھر مارا تھا اس کے سر پر۔

مادھو نے خوت زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور کہا: "چلو! یہاں سے بھاگ چلیں۔" رندھیر نے جواب دیا: "بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہیں اب کچھ نہیں کہے گا۔" تینوں بچے وہاں سے چل دیے مادھو نے پہلے ان کے ساتھ پاؤں اٹھا کی کوشش کی لیکن چند دم چل کر اس کی رفتار سست ہو گئی۔ اس نے کہا: "میرا سر دکھ رہا ہے۔ ذرا آہستہ چلو۔"

رندھیر اور موہنی نے اپنی رفتار کم کر دی۔

(۲۳)

جھیل کے کنارے پہنچ کر مادھو کو شانتا اور اپنی ماں دکھائی دی۔ کنول وحشت بھری نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ مادھو کو دیکھتے ہی وہ باغ باغ ہو گئی اور تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

"مادھو! مادھو!! میرے لال تم کہاں تھے؟" اس نے مرت کے آنسو پونچتے ہوئے کہا۔

"اور یہ کیا.... تمہارے سر پر.... اُف!.... تمہارے سر سے خون نکل رہا ہے.... تمہیں کس نے مارا....! انہوں نے....؟" اس نے رندھیر اور موہنی کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں ماما انہوں نے مجھے کچھ نہیں کہا۔“

”تو کس نے مارا تمہیں؟“

”مادھو کی خاموشی پر موہنی نے جواب دیا۔ اسے شکر نے مارا ہے۔“

کنول نے مادھو کے سر سے ہٹی کھولتے ہوئے پوچھا ”شکر کون ہے اس

نے میرے لال کو کیوں مارا؟“

”زندھیر نے جواب دیا۔ میں نے بھی اس سے بدلہ لے لیا ہے۔“

کنول نے پوچھا ”تم کون ہو بیٹا؟“

”میں زندھیر ہوں ہم اسے بھگوان دکھانے کے لیے مندر لے گئے تھے

وہاں شکر نے اسے مارا۔ میں بھی اس کا سر پھوڑا آیا ہوں۔“

کنول نے بدحواس سی ہو کر کہا ”مندر میں . . . . بھگوان دکھانے کیلئے؟“

”ہاں یہ کہتا تھا میں نے بھگوان نہیں دیکھا۔“

عہد ماضی کی کمی تصویریں کنول کی آنکھوں میں پھر گئیں اور وہ ایک گہری سوچ

میں پڑ گئی۔

”موہنی نے پوچھا تم اس کی ماں ہو؟“

”ہاں بیٹی! یہ اور بھئی تمہاری ہے؟“

”ہاں۔“

”تمہارا گھر شہر میں ہے؟“

”ہاں۔“

”یہ خون سے بھر گئی ہے۔ میں ابھی اسے دھو دیتی ہوں۔“

”نہیں اسے اس کے سر پر پہننے دیجئے۔“

”نہیں بیٹی! تمہاری ماں پوچھے گی تو کیا جواب دو گی؟“

”میں نے کئی دوپٹے گنوائے ہیں وہ مجھ سے نہیں پوچھے گی۔ آپ؟“

”زخم ابھی طرح باندھ دیں۔“

”تمہارا نام کیا ہے بیٹی؟“

”موہنی۔“

”جیتی رہو بیٹی! چلو مادھو!۔“

”زندھیر نے کہا ”چلو ہم بھی چلیں موہنی!“

”موہنی نے چلتے چلتے رک کر پوچھا ”شکر کہتا تھا یہ اچھوت ہے تم بھی

اچھوت ہو؟“

کنول نے درو بھری آواز میں جواب دیا ”ہیں . . . میں اچھوت ہوں

لیکن میرا بیٹا . . .!“

”موہنی، کنول کا مطلب نہ سمجھ سکی لیکن کم سن ہونے کے باوجود وہ محسوس

کیجے بغیر نہ رہ سکی کہ اس نے یہ سوال پوچھ کر اچھا نہیں کیا۔ اس نے گھبرا

کر دوسرا سوال کیا:

”اچھوت کیا ہوتے ہیں؟“

”تمہیں معلوم نہیں؟“

”نہیں تو!“

کنول نے جواب دیا ”اچھوت انسان ہوتے ہیں، محبت کرنے والے

انسان لیکن اس دنیا میں انہیں انسان نہیں سمجھا جاتا۔ چلو مادھو! جاؤ بیٹا تم

بھی۔!“

”موہنی اور زندھیر شہر کی طرف چل دیے۔ مادھو، کنول اور شانتا کچھ دیر وہیں

کھڑے ان کی طرف دیکھتے رہے۔ موہنی نے چند بار مڑ مڑ کر دیکھا اور اس کی آنکھیں

مادھو کو ایک نہ بھولنے والا پیغام دے گئیں۔ کنول کو مادھو کا موہنی کی طرف اس طرح دیکھنا پسند نہ تھا لیکن شہر کے خوش وضع اور خوش پوش بچے کچھ اس قدر جاذب توجہ تھے کہ اس کی اپنی نگاہیں بھی دیر تک ان کا تعاقب کرتی رہیں۔ بالآخر اس نے مادھو کی طرف دیکھا اور اپنے دل میں کہا میرے لالہ! تم ان سے کسی بات میں کم نہیں تمہارا رنگ ان سے زیادہ سفید اور تمہاری آنکھیں ان سے زیادہ خوبصورت ہیں لیکن تم اپنی ماں کے پیٹ سے ایک اچھوت کی قسمت لے کر پیدا ہوئے ہو۔ اس نے مادھو کا بازو پکڑتے ہوئے کہا: چلو بیٹا! کیا دیکھتے ہو، تمہاری دنیا ان کی دنیا سے علیحدہ ہے۔

جھونپڑی کے قریب پہنچ کر کنول کچھ سوچ کر رک گئی اور مادھو کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولی: بدھو کو کچھ نہ بتانا۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ تمہیں کسی نے مارا ہے تو وہ بدلہ لینے کے لیے بغیر نہ رہے گا اور تم سب مصیبت میں پھنسن جاؤ گے۔ مادھو نے تسلی دیتے ہوئے کہا: نہیں ماما! میں اسے نہیں بتاؤں گا۔ میں کہوں گا کہ میں درخت پر سے گر پڑا تھا۔

”اور مجھ سے یہ بھی وعدہ کرو کہ تم پھر اس طرف نہیں جاؤ گے اور ان بچوں سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گے۔“

”کیوں ماما! انہوں نے تو مجھے نہیں مارا۔“

”بیٹا! اگر ان کے ماں باپ کو علم ہو گیا کہ ان کے بچے ہمارے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں تو وہ ہمیں اس جگہ سے نکال دیں گے تم جھیل کی دوسری طرف نہ جایا کرو۔“

”بہت اچھا ماما! میں اس طرف نہیں جاؤں گا۔“

(۴۱)

ارجن، موہنی کا باپ اپنے مکان کے صحن میں آم کے درخت کے سائے تلے چار پائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ساوتری گھبراتی ہوئی باہر سے آئی۔

ارجن نے پوچھا: ”نہیں آئی موہنی؟“

ساوتری نے جواب دیا: بھگوان جلنے کہاں چلی گئی ہیں رندھیر کے گھر سے بھی پوچھ آئی ہوں۔ وہ بھی ابھی تک نہیں آیا۔

”تو پھر اس کے ساتھ کہیں کھیل رہی ہو گی۔ تم اس قدر پریشان کیوں ہو جب بھوک لگے گی آجائے گی۔“

”تم یہاں کیا کر رہے ہو جاؤ نا اس کو تلاش کرو وہ جھیل پر گئے ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔۔۔۔!“

ارجن نے ساوتری کو چھڑنے کی نیت سے کہا: ”موہنی تمہاری طرح بیوقوف نہیں وہ مندر میں گئی ہو گی۔“

”اچھا آئیے دو! آج میں اس کی اچھی طرح خبر لوں گی۔“

”اے کچھ نہ کہنا اس عمر میں ہم بھی سارا دن باہر گزارا کرتے تھے۔“

”تمہارے پیاری نے تو اسے بگاڑا ہے۔“

”اچھا سر نہ کھاؤ! میں جاتا ہوں۔“ ارجن اٹھ کر جوتا پہن رہا تھا کہ باہر کا دروازہ کھلا اور موہنی اور رندھیر داخل ہوئے۔

ارجن نے پھر چار پائی پر بیٹھتے ہوئے کہا: ”وہ آگئی۔ تم نے مفت میں شہر چار کھا تھا کیوں بیٹی؟ اس نے موہنی سے مخاطب ہو کر پوچھا: ”تم نے اتنی دیر کہاں لگائی؟“

پتا جی ہم جھیل پر گئے تھے اور وہاں پر..... موہنی آگے کچھ نہ کہہ سکی  
اس کا گلا بیٹھ گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

وہاں پر کیا ہوا؟ مائیں تم رورہی ہو بتاؤ تو سہی کیا ہوا؟  
سادتری تے کہا بیٹی! بتاتی کیوں نہیں۔ کیا ہوا جھیل پر۔ وہاں کسی نے  
مارا تمہیں؟

موہنی نے دل کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا جھیل پر ایک  
لڑکا نہار ہاتھا اس نے مجھے یہ پھول دیے۔ ہمیں بگلے کے بچے دکھائے ہم  
اسے بھگوان جی کے درشن کو انے کے لیے مندر لے گئے۔ شکر نے ڈنڈا مار کر  
اس کا سر چھوڑ دیا۔ موہنی یہ کہہ کر سسکیاں لینے لگی۔

ارجن نے پوچھا شکر نے اسے کیوں مارا؟  
موہنی کی خاموشی پر رند حیرنے جواب دیا وہ کہتا تھا یہ اچھوت ہے۔  
اچھوت؟ ارجن نے بدحواس ہو کر کہا ہرے ہرے! تم اچھوت کو  
مند میں لے گئے تھے۔ اور موہنی! یہ پھول تم نے ایک اچھوت کے ہاتھ سے  
لیے ہیں؟

ہاں اور یہ سیپ بھی!  
انہیں دور پھینک دو موہنی۔ یہ پوتر ہیں اور سادتری اقم موہنی کو نہلا کر  
اس کے کپڑے بدل دو۔

موہنی ان پھولوں کے پوتر ہونے کا راز نہ سمجھ سکی وہ بولی پتا جی! یہ تو  
اس نے جھیل کے صاف پانی سے توڑے تھے۔

پانی صاف ہو یا لگا لگا۔ اچھوت کے ہاتھ کے توڑنے ہوئے پھول  
پوتر نہیں ہو سکتے۔

پتا جی! اس کے ہاتھ بھی صاف تھے۔ ہم گئے تھے تو وہ نہار ہاتھا۔  
ارجن نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا اچھوت نہا کر چھوت نہیں بن سکتے  
منی ڈھل کر میرا نہیں بن سکتی۔ پھینک دو ان پھولوں کو۔

موہنی نے ارجن کی منطق سے زیادہ اس کی گرجتی ہوئی آواز سے مرعوب  
ہو کر پھول پھینک دیے۔ صحن میں کھڑی ہوئی بچھیا اٹھ کر پھولوں کی طرف بڑھی  
اور چند بار سونگھنے کے بعد منہ کھولے بغیر پیچھے ہٹ گئی۔

ارجن نے کہا دیکھا ہماری گائیں بھی شودروں کے ہاتھ کی شے نہیں  
کھاتیں!

رند حیر جو اس وقت تک خاموش کھڑا تھا، بول اٹھا کنول کے پھول  
تو کھائے کھایا ہی نہیں کرتی اگر آپ اپنے ہاتھوں سے بھی توڑ کر لائیں تو بھی یہ منہ نہ  
لگائے گی۔ بہت بھوک ہو تو شاید کھالے۔

تم خاموش رہو۔ ارجن نے اپنا کھسیا نہ پن پھیلاتے ہوئے کہا۔  
رند حیر خاموش ہو گیا۔ موہنی نے اس کا دل رکھنے کے لیے اس سخت کو  
ٹولی دینا ضروری خیال کیا۔ وہ بولی پتا جی! اس کے ہاتھ بالکل ہماری طرح تھے  
اگر یہ پھول ہمارے ہاتھوں سے پوتر نہیں ہوتے تو اس کے ہاتھ لگنے سے کیسے  
پوتر ہو گئے؟

بیٹی! وہ سر سے لے کر پاؤں تک پوتر ہیں اور ان کی چھوت سے ہر  
پوتر شے پوتر ہو جاتی ہے۔

پتا جی! انہیں مندر میں لے جانا بھی پاپ ہے؟  
مہا پاپ  
کیوں؟

اس لیے کہ بھگوان انہیں دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔ وہ بھگوان کے منہ کو بھر مٹھ کر دیتے ہیں۔

”بھگوان ان سے نفرت کیوں کرتا ہے کیا وہ اس کے بنائے ہوئے نہیں؟“  
”تم بہت بے وقوف ہو مونی۔ بھگوان نے انہیں بنایا ہے لیکن وہ نیچ ذات ہیں۔“

”وہ نیچ ذات کیوں ہیں؟“

”کیونکہ بھگوان نے انہیں اپو تر مٹی سے بنایا ہے۔“

”بھگوان نے انہیں اپو تر مٹی سے کیوں بنایا؟“

”مونی اب زیادہ بکواس کی تو زبان کیلئے ڈالوں گا۔ بھگوان کی مرضی میں

بہم دخل نہیں دے سکتے وہ جسے چاہتا ہے اونچی ذات اور جسے چاہتا ہے نیچی ذات میں پیدا کرتا ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں ایک جیسی نہیں ہوتیں چاند سورج سے چھوٹا اور ستارے اس سے چھوٹے ہیں۔ باغ میں کوئی درخت بڑا اور کوئی چھوٹا ہوتا ہے۔ کانٹے دار جھاڑیاں اور پھل دار درخت ایک ہی باغ میں اگتے ہیں۔ لیکن ایک کو کاٹ کر جلا یا جاتا ہے اور دوسرے کو سلامت رکھنے کے لیے پانی دیا جاتا ہے۔“

مونی بظاہر مطمئن ہو کر خاموش ہو گئی لیکن وہ دل ہی دل میں ایسے بے انصاف بھگوان کو کوس رہی تھی جس نے شکر جیسے بد وضع آدمی کو پوتر اور مادھو جیسے خوب صورت لڑکے کو اپو تر مٹی سے پیدا کیا تھا۔ اس بحث کے اختتام پر اس کے دماغ میں بھگوان کا تصور ایک زبردست مگر نا انصاف۔ ایک غلیم لیکن مہبت ناک طاقت کا تھا اور اپنے انصاف پسند اور رحم دل بھگوان کا یہ نیا تصور اس کے معصوم دل پر ایک ناقابل برداشت بوجھ تھا۔ عام حالات میں مونی کی عمر کی کوئی اور

لڑکی شاید اس مسئلہ پر زیادہ غور نہ کرتی لیکن وہ غیر معمولی طور پر ذہین تھی اور کسی واقعہ کو سطحی نظر سے دیکھنے کی عادی نہ تھی اس کے دماغ پر جو بھگوان کے بہترین تصورات سے روشن تھا نادانستہ طور پر اضطراب کی سیاہی آہستہ آہستہ قبضہ جانے لگی۔

## بھگوان کا اوتار

چار سال کی جسمانی اور ذہنی ترقی نے ان بچوں کو چھوت اور اچھوت کے درمیان پیدائشی فرق کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا۔ رندھیر اور موہنی کے ماحول نے انہیں یہ سکھا دیا تھا کہ وہ پچھلے جنم کی کسی نیکی کی بدولت اور نچی ذات والوں کے گھر پیدا ہوئے ہیں۔ مادھو کو بھی اپنے متعلق یہ علم ہو چکا تھا کہ وہ ایک قسمت اچھوت ہے لیکن اسے اس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا کہ وہ اچھوت کیوں ہے؟

اپنے بھونپڑے کے باہر اس کی پرواز صرف ان لوگوں کے گھروں تک محدود تھی جو اس کی طرح ہندو سماج کے خوب صورت اور مقدس شہر کی چار دیواری سے باہر اپنے بوسیدہ بھونپڑوں میں زندگی کے بُرے بھلے دن گزار رہے تھے اور یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے کہ وہ اچھوت کیوں ہیں۔ انہیں اور نچی ذات والوں کے اس عقیدہ کا بھی علم نہ تھا کہ وہ پچھلے جنم کے کسی ناقابل تلافی گناہ کی نزا بھگتنے کے لیے اچھوت بنا دیے گئے ہیں۔

معمولی حالات میں مادھو کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ان مسائل پر زیادہ توجہ دیتا۔ لیکن موہنی اور رندھیر کی ملاقات پر یہ نیا انکشاف کہ تمام چیزیں بھگوان کی بنائی ہوئی ہیں اس کی سادہ اور مختصر سی کتاب زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کر چکا تھا۔ صبح و شام ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر کبھی شہر اور کبھی اچھوتوں کی بستی کی

طرف دیکھتا اسے ایک طرف مسرت زقص کرتی اور دوسری طرف بے کسی کے آنسو بہاتی نظر آتی۔ وہ بھونپڑوں کی غربت اور افلاس کے دل شکن مناظر سے آنکھیں پھیر لیتا اور شہر کے اونچے ایوانوں کی شان و شوکت اور ان میں بسنے والوں کی عظمت سے مرعوب ہو کر رہ جاتا۔ جب سورج غروب ہو جانے پر شہر کے قریب مندر کی گھنٹی بجتی اور دفعا میں ناقوس کی آواز گونجتی تو اس کے خیالات اس عظیم الشان عمارت کے اندر گھر چکر لگاتے جس میں دنیا کی ہر ادنیٰ اور اعلیٰ شے کا پیدا کرنے والا موجود تھا۔ مندر کے بھگوان کی خیالی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی اور وہ اپنی بد حالی اور بے کسی بھول کر کائنات کی اس زبردست قوت کی تعظیم کے لیے سر جھکا دیتا۔ جس کے دم سے دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی رنگینی اور پھولوں کی تازگی قائم تھی جس کے اشاروں پر مہائیں چلتی۔ بادل دوڑتے اور بجلیاں گونجتی تھیں۔ جس نے سورج کو جاہ و جلال، چاند کو دل فریبی۔ ستاروں کو دل کشی اور پھولوں کو روحانی عطا کی تھی۔ مادھو کو بھگوان کے روشن تصورات کے سامنے اپنے ماحول کی تاریکیاں سنٹی نظر آتیں۔ زمین و آسمان پر بھگوان کی عظمت کا اعتراف کر دینے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اور اگر یہ دل کش مناظر نہ بھی ہوتے تو بھی مادھو اس بھگوان کو کیوں کر بُرا کہہ سکتا تھا جس نے رندھیر اور موہنی جیسی تصویریں بنائی تھیں۔ اگر مادھو اور ان بچوں کے درمیان سماج کی ناقابل عبور دیوار حائل نہ ہوتی اور اگر ان سے ملنے کی تمام راہیں مسدود نہ ہوتیں تو یہ دنیا اس کے لیے کس قدر رنگین ہوتی؟ قدرت کے یہ مناظر اسے کس قدر حسین نظر آتے؟ رندھیر اسے یاد آتا تھا لیکن اس کی یاد میں وہ بے قراری نہ تھی جو موہنی کی یاد میں تھی۔ موہنی کے بغیر اسے بھگوان کی یہ دنیا ان تمام حسین مناظر کے باوجود غیر مکمل نظر آتی تھی۔ جب رات کی تاریکی اچھوتوں کے بھونپڑوں کو اور زیادہ بے رونق بنا دیتی

اور شہر کا ہر کوچہ چرائوں سے جگمگا اٹھا تو مادھو کے معصوم دل میں اضطراب کی ایک لہر اٹھتی وہ اپنے دل میں کتنا رندھیر اور موہنی اپنی ذات کے بچوں کے ساتھ ان چرائوں کی روشنی میں کیسے ہوں گے۔ کاش! میں بھی ان میں سے ایک ہوتا۔ ان کے ساتھ کیسے لیتا۔ انہیں بنسری سناتا۔ ان کے ساتھ بھگو ان کے خوبصورت مندروں کی سیر کرتا۔ وہ مجھے بھول چکے ہوں گے۔ نہیں! نہیں! وہ مجھے نہیں بھولے ہوں گے۔ وہ کسی دن میری تلاش میں ضرور آئیں گے۔ میں رندھیر کو بھیل عبور کر کے دکھاؤں گا۔ موہنی کو گہرے پانی سے بھول لا کر دوں گا۔ وہ بہت خوش ہوگی لیکن نہیں۔ میں ایک اچھوت ہوں وہ میرے توڑے ہوئے بھول کو ہاتھ نہیں لگائے گی۔ وہ میری طرف دیکھ کر آنکھیں بند کر لے گی۔ میری آواز سن کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے گی۔۔۔ لیکن کیوں؟

مادھورات کے وقت سونے سے پہلے اکثر یہ ارادہ کرتا کہ صبح وہ بھیل کے دوسرے کنارے جا کر موہنی اور رندھیر کی راہ دیکھے گا لیکن رات کی تاریکی کے سہانے سپنوں کی دنیا صبح کی روشنی میں درہم برہم ہو جاتی وہ کبھی تو بھیل کے دوسرے کنارے جانے کا ارادہ بدل دیتا اور کبھی امید ویم کے طے جلے جذبات کے ساتھ بدھو اور کنول سے آنکھ بچا کر اپنی منزل مقصود کا رخ کرتا لیکن مذرتک پہنچتے پہنچتے مصالحتیں اس کی اٹھتی ہوئی انگلیوں کو دبا لیتیں۔

اسے بار بار یہ خیالات پریشان کرتے۔ شہر والوں نے انہیں چھوت اور اچھوت کا فرق سمجھا دیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ وہ میری طرف دیکھ کر خفارت سے منہ پھیر لیں لیکن اگر وہ بدل نہ بھی گئے ہوں تو بھی میرا ان سے ملنا ٹھیک نہیں ہے اگر شہر والوں کو اس بات کا علم ہو گیا تو ہمیں مار کر نکال دیں گے اور پھر ان سے ملنے کی امید ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر مادھو واپس لوٹ آتا

لیکن عقل ہر وقت دل کا ساتھ نہ دیتی۔ بعض اوقات ارادے کا سیلاب مصلحتوں کے بند کو بہا لے جاتا۔ اور مادھو مندر کے راستے کے قریب کسی جھاڑی کے نیچے چھپ کر یا کسی درخت کے اوپر چڑھ کر موہنی کی راہ دیکھتا۔ چند مرتبہ اسے رندھیر اور موہنی کو مندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھنے میں کامیابی بھی ہوئی لیکن وہ اکیلے نہ تھے۔ شہر کی چند لڑکیاں اور لڑکے ان کے ساتھ ہوتے اور مادھو کو ان کے سامنے جانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

(۲)

ایک دن وہ درخت پر چڑھ کر ان کا انتظار کر رہا تھا کہ رندھیر، موہنی اور گاؤں کے اور آٹھ دس بچے آتے اور بھیل کے کنارے بھیل کو وہیں مصروف ہو گئے۔ رندھیر کو دوسرے لڑکوں کے ساتھ تیر تار دیکھ کر مادھو کے دل میں کئی بار درخت سے اتر کر بھیل میں کودنے کا خیال آیا لیکن ایک شور و کار کا احساس کتری اس کی راہ میں حائل رہا۔ موہنی اپنی سیلیوں کے ساتھ اس درخت سے پندرہ فٹ گز کے فاصلے پر بھیل کے کنارے کھڑی تھی۔ مادھو کے نزدیک دوسرے درخت پر ایک کوئل نے کوہو، کوہو کا ترانہ چھیڑا اور موہنی درخت کی طرف منہ پھیر کر کوئل سے کہیں زیادہ میٹھی آواز میں اس کے نعروں کا جواب دینے لگی۔ مادھو کو اس کا چہرہ اب اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ شہر کے دوسرے بچوں کے ساتھ وہ تاروں میں چاند معلوم ہوتی تھی۔

موہنی کوہو، کوہو کہتی ہوئی کوئل کو دیکھنے کے لیے درخت کی طرف بڑھی۔ مادھو کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ موہنی کی نگاہوں سے بچتا درخت کی ٹہنیوں سے

لگتا ہوا ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے درخت پر جا پہنچا اب وہ جھیل کے کنارے کھینٹنے والے بچوں کی نگاہوں کی رسائی سے باہر تھا۔ اسے صرف موہنی نظر آرہی تھی۔ کوئل خاموش ہو چکی تھی اور موہنی درختوں کے درمیان کھڑی اور اُدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ مادھو درخت سے نیچے اترا اور موہنی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا دل مسرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ موہنی کوئل کو دیکھنے سے مایوس ہو کر واپس لوٹنے لگی۔

مادھو نے محسوس کیا کہ قدرت کا ہاتھ اسے مسرت کے آسمان سے کھینچ کر زمین کی بھیاں لگ گرا نیوں کی طرف لا رہا ہے۔ اتنی خواہشوں، التجاؤں اور دعاؤں کے بعد موہنی آئی اور اب جا رہی ہے۔ مادھو اسے برداشت نہ کر سکا۔ شور و گالیاں کھینچنا ہو گیا۔ انسانیت کا دبا ہوا شعور جاگ اٹھا اور اس شعور کے بے پناہ سیلاب کے ایک ہی ریلے نے تمام وہ دلیاریں جو چھوت اور اچھوت کے درمیان صدیوں میں تعمیر ہوئی تھیں توڑ ڈالیں۔ مادھو نے جلدی سے اپنی جیب سے بفسری نکالا اور موہنی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے دھیمے سروں میں ایک نغمہ چھیڑ دیا۔ یہ دھیمے سر شور کی دبی ہوئی آواز کے ترجمانی تھے۔ موہنی بفسری کی آواز سن کر رُک کر کچھ سوچ کر واپس مڑی اور اضطراب، مسرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اُدھر اُدھر دیکھتی ہوئی مادھو کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ مادھو کے دل میں ایک طوفان سا اٹھا اور بفسری اس کے ہونٹوں سے جدا ہو گئی۔

موہنی نے کہا: "کوئل؟ مادھو۔۔۔۔۔ مادھو۔۔۔۔۔!"

موہنی کی آواز میں نفرت یا حقارت کی بجائے شفقت، انس اور مروت پا کر مادھو نے مسکرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس مسکراہٹ کے ساتھ احسانندی کے آنسو اس کی آنکھوں میں چھلکنے لگے۔

"موہنی! تم آگئیں! تم نے مجھے پہچان لیا؟" مادھو نے یہ کہتے ہوئے آنکھیں جھپکیں اور چپکتے ہوئے آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپک کر گالوں پر سے ہوتے ہوئے زمین پر آگرے۔

موہنی نے کہا: "میں اور زندہ ہیر کئی بار جھیل پر آئے لیکن تم کہیں نظر نہ آئے اتنی دُور کہاں رہے؟"

"مادھو نے جواب دیا: "تم مجھے بھولے نہیں۔ میں یہیں رہتا تھا۔ ماما نے جھیل پر آنے سے منع کر دیا تھا لیکن میں چپ چپ کر کئی بار یہاں آیا ہوں نہیں ابھی کئی بار دیکھ چکا ہوں لیکن تمہارے ساتھ دوسروں کو دیکھ کر میں تمہارے سامنے نہ آسکا۔"

موہنی ایک گہری سوچ میں کچھ دیر مادھو کی طرف دیکھتی رہی وہ شہر کے تمام لوگوں سے خوبصورت تھا اس کا جسم مندر کی سب سے زیادہ حسین مورتی سے زیادہ سڈول اور متناسب تھا لیکن پھر بھی وہ ایک شور و تھا اور موہنی حیران تھی کہ اسے اس سے نفرت کیوں نہیں ہوتی وہ اس کو دیکھ رہی تھی اس کی آواز سن رہی تھی اس کے باوجود وہ اپنی جگہ سے نہ ہل سکی۔ شور کے آنسو کچھ دیر اس کے دہاں ٹھہرنے کی قیمت ادا کر چکے تھے۔

"اچانک زندہ ہیر کی آواز آئی" موہنا! موہنا! کہاں ہو؟ آؤ گھر چلیں۔"

موہنی نے خوف زدہ ہو کر کہا: "میں جاتی ہوں۔"

مادھو نے سراپا التجا بن کر کہا: "پھر آؤ گی؟"

شاید..... مجھے معلوم نہیں" موہنی نے جھیل کی طرف بھاگتے ہوئے

جواب دیا۔

مادھو کی زندگی کی روشنی درختوں کی آڑ میں غائب ہو گئی لیکن اس کے دل

کی مغموم فضا میں امید کے ہزاروں چراغ جگمگا اٹھے۔ وہ اچھلتا کودتا اور ہنسی بجاتا ہوا گھر پہنچا۔ کنول نے کھانا لاکر سامنے رکھا اس نے چند لمحوں کے کھائے اور کہا "نانا! مجھے بھوک نہیں۔"

"آج بہت خوش ہو بیٹا! کہاں گئے تھے؟"

"یہیں تھا ماما! تمہیں ہنس رہی سنا تا ہوں۔"

مادھو یہ کہہ کر ہنس رہی بجانے لگا۔ اس پاس کے شوروروں کے بچے اس کی ہنسری کی آواز سن کر اس کے گھر جمع ہو گئے۔

شام کے وقت حسب معمول مادھو نے ایک پہاڑی کا رخ کیا۔ آج اس کا جسم بہت ہلکا معلوم ہوتا تھا اور وہ چلنے کی بجائے بھاگ رہا تھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ آج بھگوان کی دنیا اسے مکمل نظر آتی تھی۔ آج اسے بھگوان کی زبردست قوت کا اعتراف ہوا تھا۔ مومنی اسی کے اشارے سے جھیل پر پہنچی تھی اسے درخت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوئل کو بھی اسی نے بھیجا تھا۔ اس کی ہنسری کے سرور کو بھگوان ہی نے یہ تاثر عطا کی تھی کہ مومنی چلتے چلتے واپس لوٹ آئی اور یہ بھی اسی کی دیا تھی کہ ایک اونچی ذات کی لڑکی نے اتنے سالوں کے بعد اسے دیکھتے ہی پہچان لیا اور اس کے ساتھ نفرت سے پیش نہ آئی۔

بھگوان کے اس خوش گوار تصور نے اس کی دلی ہوائی انگلیوں کو اٹھتے ہوئے دلوں میں تبدیل کر دیا وہ تصور میں اپنی بوسیدہ جھوپڑی سے نکل کر شہر کے خوبصورت مکانات کی سیر کر رہا تھا۔ وہ ایک ایسی دنیا کی تعمیر کا خواب دیکھ رہا تھا جس میں بسنے والے چھوت اور اچھوت کے الفاظ سے نا آشنا تھے۔ بھگوان کی زبردست طاقت پر اعتماد اور یقین کی بدولت زندگی کے ہر افریقہ پروری

کی گھٹائیں اسے صبح کی آمد کا پیغام دینے لگیں۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا:

"بھگوان! میں جانتا ہوں کہ میں ایک اچھوت ہوں۔ مجھے تیرے مندر میں پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں ان کے شہر میں بھی نہیں جا سکتا لیکن تو بھگوان بنے اور تیرے لیے یہ مشکل نہیں کہ دنیا سے چھوت اور اچھوت کا امتیاز مٹا دے۔ اس دعا کے بعد مادھو اونچی آواز میں وہ بھجن گانے لگا جو اس نے چار سال قبل زندھیر اور مومنی سے مندر میں سیکھا تھا۔

اگلے دن مادھو جھیل کے کنارے چلتی مٹی سے بھگوان کی عجیب و غریب مورتی بنا کر اسے خوش کرنے کے لیے بھجن گا رہا تھا۔

(۳)

تین سو سال اور گزر گئے۔ مادھو اس عرصہ میں مٹی کی مورتیاں بنانے میں کافی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ کئی مورتیاں بنانا کر توڑنے کے بعد اس نے ایک ایسی مورتی بنائی جو باقی تمام مورتیوں کے مقابلے میں خوب صورت تھی۔ مادھو نے اسے جھیل کے کنارے ایک جھاڑی میں چھپا کر رکھ دیا۔

دھ دن میں کم از کم ایک بار جھیل پر ضرور آتا اور بھگوان کی خود ساختہ مورتی کے سامنے مومنی اور زندھیر سے سیکھا ہوا بھجن گا کر واپس آ جاتا۔

ایک دن زندھیر اور مومنی مندر سے واپس آتے ہوئے جھیل کے قریب سے گزرے انہیں کچھ فاصلے پر ہنسری کی دلکش آواز سنائی دی۔ مومنی نے چلتے چلتے رک کر کہا: "زندھیر! بھلا یہ ہنسری بجانے والا کون ہو سکتا ہے؟"

زندہ میر نے جواب دیا "میں نے پرسوں یہاں سے گزرتے ہوئے بھی یہ  
آواز سنی تھی۔ کوئی خوب بجاتا ہے؟"  
"تم نے اسے کبھی دیکھا نہیں؟"  
"کبھی نہیں۔"

"تم نے دیکھا ہے لیکن تم بھول گئے ہو۔"  
"میں نے دیکھا ہے اکب؟"

موسنی نے کہا "تمہیں وہ دن یاد ہے جب ہمیں جھیل کے کنارے ایک لڑکا  
ملا تھا اور ہم اسے مندر میں لے گئے تھے۔"

"ہاں وہ....." زندہ میر نے اپنے حافظہ پر زور دیتے ہوئے کہا "مجھے  
شکر ہے مارا تھا۔ کیا نام تھا اس کا..... مادھو؟"

موسنی نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا "چلو اسے دیکھیں۔"  
"لیکن وہ تو شاید اچھوت تھا۔"

موسنی کا دل بیٹھ گیا اس نے کہا "لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ اچھوت  
ہے۔ شاید تم بھی اسے دیکھ کر اچھوت نہ کہہ سکو۔"

زندہ میر نے جواب دیا "اچھوت شکل سے تو ظاہر نہیں ہوتے۔"  
موسنی نے کہا "زندہ میر! بھلا ہم اچھوتوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟"  
زندہ میر کو موسنی اور اس کے باپ کا مباحثہ یاد آگیا۔ اس نے جواب دیا میں  
نے اس کے متعلق کبھی نہیں سوچا۔

بفسری کا دل کش لغتہ ختم ہوا اور کسی کے گانے کی آواز سنائی دی۔ یہ  
وہی بھجن تھا جسے مادھو بھیریوں کے دل کش سُرور میں گارہا تھا۔  
زندہ میر نے چونک کر کہا "نہیں، یہ کوئی اچھوت نہیں ہو سکتا یہ بھجن گارہا۔"

ہے اور اس کی آواز ہمارے شہر کے تمام بھجن گانے والوں سے ملتی ہے۔ چلو  
موسنی اسے دیکھیں!

موسنی زندہ میر کو بتانا چاہتی تھی کہ یہ وہی بھجن ہے جو مادھو نے ان سے مندر  
میں سیکھا تھا۔ لیکن مادھو کو دیکھنے کی خواہش اس کی ہر خواہش پر غالب آگئی اور وہ  
کچھ کہے بغیر زندہ میر کے ساتھ چل دی۔

کچھ دور چلنے کے بعد موسنی اور زندہ میر ایک بھاری کے قریب کھڑے مادھو  
کو اپنے دل کش راگ کی گھڑائیوں میں کھویا ہوا دیکھ رہے تھے۔ زندہ میر اسے  
پہچان نہ سکا۔

مادھو نے راگ ختم کر کے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور زندہ میر اور موسنی کو دیکھ کر  
مہرہوت سا ہو کر رہ گیا اس نے تھوڑی دیر کے بعد سنبھل کر کہا "تم آگئے! بھگوان  
نے تمہیں بھیج دیا۔"

اس سوال پر زندہ میر نے موسنی اور موسنی نے زندہ میر کی طرف دیکھا۔ بالآخر موسنی  
نے جواب دیا "ہم تمہاری آواز سن کر آئے ہیں۔ تم بہت اچھا گانے ہو۔"  
"تمہیں میرا گانا پسند ہے؟"

"کیوں نہیں۔ زندہ میر ابھی یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے شہر میں تم سے اچھا گانے  
والا کوئی نہیں۔"

زندہ میر نے پوچھا "تم مادھو ہو؟"

"ہاں تم نے مجھے نہیں پہچانا؟"

"یہ بھجن تم نے کہاں سے سیکھا؟"

"تمہیں یاد نہیں۔ تم ہی نے تو سکھایا تھا مجھے۔"

"کہاں اکب؟"

”اس دن! مندر میں؟“

رندھیر کو بہت سی باتیں یاد آ گئیں اس نے پھر پوچھا ”لیکن یہ تو بہت مدت کی بات ہے تمہیں اب تک یہ بھیج کیسے یاد رہا؟“

”میں اسے ہر روز بھگوان کے سامنے گایا کرتا ہوں۔“

تمہارا بھگوان؟ وہ کہاں ہے؟

اس جھاڑی میں۔ ٹھہروں میں تمہیں ابھی دکھاتا ہوں۔ مادھو نے جھک کر جھاڑی کے نیچے سے مٹی کی مورتی نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی۔

رندھیر نے پوچھا: یہ تم کہاں سے لائے؟

مادھو نے جواب دیا۔ میں نے خود بنایا ہے۔ یہ تمہارے بھگوان سے بہت چھوٹا ہے میں اب ایک بڑا بھگوان بناؤں گا۔ بالکل تمہارے بھگوان جیسا۔ تم اسے دیکھنے کے لیے آؤ گے؟

اس کے جواب میں رندھیر اور موہنی خاموش رہے۔

مادھو نے سراپا انتخاب کر آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ ضرور آنا میں ہر روز پہاڑی پر چڑھ کر تمہارے خوبصورت شہر کو دیکھتا ہوں۔ سال میں ایک رات وہاں بہت روشنی ہوا کرتی ہے۔ ہر مکان پر چراغوں کی قطاریں نظر آتی ہیں۔“

موہنی نے کہا: ”ہاں وہ دیوالی کی رات ہوتی ہے۔“

”دیوالی کیا ہوتی ہے؟“

اس دن رام چندر جی لٹکا کو مستح کر کے گھر واپس آئے تھے اور شہر والوں نے ان کے آنے کی خوشی میں میے جلانے تھے۔

”رام چندر جی کون تھے؟“

”وہ بھگوان کے اوتار تھے۔“

”بھگوان کا اوتار کیا ہوتا ہے؟“

”ایک ایسا انسان جس میں بھگوان جیسی طاقت ہو۔“

”انسان میں بھگوان جیسی طاقت کیسے آسکتی ہے؟“

”اس کی پوجا کرنے سے۔“

”تو میں بھی بھگوان کی پوجا کیا کروں گا لیکن ماما کہتی تھی کہ تم خواہ کچھ کرو، اونچی ذات والوں کی برابری نہیں کر سکتے۔ کیا میں بھگوان کی پوجا سے بھی تمہارے جیسا نہیں بن سکتا؟“

موہنی خاموش رہی۔ اس کی آنکھیں رندھیر سے اس سوال کا جواب پوچھ رہی تھیں۔

مادھو نے بیتاب ہو کر کہا: ”بتاؤ! بھگوان کے لیے بتاؤ۔ کیا میں تمام عمر شوروں میں رہوں گا؟“

موہنی نے جواب دیا۔ نہیں! نہیں! بھگوان تمہاری مدد کریں گے۔

کسی نے جھیل کی طرف سے آواز دی۔ ”بھیا! بھیا!“

مادھو نے شاننا کی آواز پہچان کر جلدی سے مورتی کو اٹھا کر جھاڑی میں چھپا دیا اور کہا ”شاننا میں یہاں ہوں۔“

رندھیر اور موہنی جانا چاہتے تھے لیکن شاننا کو دیکھ کر رُک گئے۔ شاننا نے دھنڈول کھاڑے نمودار ہوتے ہوئے کہا ”میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

مادھو نے جواب دیا: ”کچھ نہیں۔ شاننا آؤ۔“

مادھو کے پاس رندھیر اور موہنی کو دیکھ کر شاننا لجاتی ہوئی آگے بڑھی۔

”یہ تمہاری بہن ہے؟“ رند حیر نے سوال کیا۔

”ہاں! تم نے نہیں پہچانا اسے؟“

رند حیر نے مادھو کو کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے شاننا کو کوئی بار سر سے پاؤں تک دیکھنے کے بعد اپنے دل میں کہا: ”کیا یہ ممکن ہے کہ یہ دونوں بہن بھائی بنیں؟“  
ہوں۔ ہمارے شہر میں ان جیسا کوئی برہمن ہے نہ کشتری۔ کیا بھگوان ایسی صورتیں بنا کر ان سے نفرت کر سکتا ہے؟“

رند حیر نے کہا: ”اچھا مادھو! اب ہم جانتے ہیں لیکن میں تم سے ایک بات کہتا ہوں۔“  
”کہو۔“

”وہ مورتی چھپا کر رکھنا اور اُسندہ شہر کے کسی آدمی کے سامنے یہ بھجن گانا۔“  
”مورتی تو میں چھپا کے ڈر سے چھپا کر رکھتا ہوں لیکن بھجن گانے میں کیا ہرج ہے؟“

”تم نہیں جانتے لیکن اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ چلو موہنی!“  
رند حیر اور موہنی چل دیے اور مادھو اور شاننا ورت تک کھڑے انہیں دیکھتے رہے۔

”یہ کون تھے؟“ شاننا نے پوچھا۔

مادھو نے جواب دیا: ”بھگوان کے اتار۔“

”وہ کیا ہوتے ہیں؟“

”تم نہ سمجھ سکو گی۔ چلو گھر چلیں۔“

شاننا نے مزہ بناتے ہوئے کہا: ”واہ! تو میں تمہاری جیسی سمجھ بھی نہیں کھتی

تمہارا مطلب یہی تھا کہ یہ شہر والے ہیں؟“

مادھو ہنس پڑا۔

اب تک رند حیر کی زندگی کی تمام دلچسپیاں سیر و شکار، نیزہ بازی اور گھوڑے کی سواری تک محدود تھیں۔ اس کے لیے بھگوان، دیوتا، چھوت اور اچھوت کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس نے چلتے چلتے رک کر موہنی سے سوال کیا: ”موہنی کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بھگوان، شاننا اور مادھو جیسی رتیں بنائے اور پھر ان سے نفرت کرے؟“

موہنی نے جواب دیا: ”رند حیر! میرا تو یہ خیال ہے کہ بھگوان کسی سے بھی نفرت نہیں کرتا۔ جب ایک ماں اپنے غریب صورت اور بد صورت بچوں سے یکساں طور پر پیار کرتی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ بھگوان! جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے سب کو ایک جیسی آنکھیں اور ایک جیسے ہاتھ پاؤں دیے ہیں۔ وہ ایک انسان کو پوتر اور دوسرے کو اپوتر سمجھتا ہو۔“

## سنگ تراش

شام کے وقت آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ کنول، بدھو، شاننا اور مادھو کھانا کھانے کے بعد جھونپڑی سے باہر چار پائیوں پر لیٹ گئے مغرب کی طرف بچلی چمکی اور بدھو اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کنول نے کہا: "کیوں بھیا! تم تو کہتے تھے مجھے بہت نیند آرہی ہے۔" بدھو نے چار پائی اٹھاتے ہوئے جواب دیا: "یر بادل برسے گا ضرور" اور میری نیند خراب ہوگی۔ میں اندر جاتا ہوں۔ آج گرمی تو ہے نہیں۔"

شاننا نے کہا: "میں بھی اندر سوؤں گی۔ چلو بھیا! تم بھی اندر چلو۔" مادھو، شاننا کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے کنول سے مخاطب ہو کر بولا: "اما! اٹھو۔ تمہاری چار پائی اندر ڈال دوں۔ بارش آگئی تو رات کو تمہاری نیند خراب ہوگی۔"

کنول اٹھ کر جھونپڑی میں چلی گئی اور مادھو نے اس کی چار پائی اٹھ کر اندر پہنچا دی۔

کنول نے اپنی چار پائی پر لیٹے ہوئے کہا: "بیٹا! تم بھی اپنی چار پائی اندر لے آؤ۔"

مادھو نے باہر نکلتے ہوئے جواب دیا: "مجھے ابھی نیند نہیں آئی اما! اندر کچھ گرمی ہے۔ میں ابھی آجاتا ہوں۔"

بدھو نے کہا: "بارش آگئی تو ہمیں نہ جگانا۔"

"نہیں چچا! میں مجھے پاؤں اندر آ جاؤں گا۔"

مادھو باہر کر اپنی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ دُور سے مندر کی گھنٹی کی آواز آرہی تھی اور مادھو کا دل دھڑک رہا تھا۔

شاننا نے اندر سے آواز دی: "بھیا! مجھے کمافی سناؤ۔"

مادھو نے جواب دیا: "اری چپ! اچھا کی نیند خراب ہوگی۔"

"شور نہ کرو شاننا!" بدھو نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"تو میں باہر آجاتی ہوں۔"

شاننا بیسے پاؤں باہر نکلی اور مادھو جلدی سے بستر پر لیٹ کر خراٹے لینے لگا۔

"ہوں مگنا کہیں کا۔ ابھی باتیں کر رہا تھا اور اتنی جلدی سو بھی گیا ہے۔"

"دیکھو شاننا! مجھے تنگ نہ کرو ورنہ پیٹوں گا۔"

کنول نے اندر سے آواز دی: "شاننا! کیوں تنگ کرتی ہو اسے۔ یہیں رات

کو بھی آرام نہیں آتا؟"

بدھو پھر ایک بار بڑبڑایا: "شاننا! کیا شور مچا رکھا ہے تم نے؟"

شاننا مایوس ہو کر اندر چلی گئی۔

مادھو بستر سے اٹھا اور بیسے پاؤں جھونپڑی کے پیچھے سے ہوتا ہوا جھیل

کی طرف چل دیا۔ تھوڑی دُور جا کر وہ راستے کے درختوں اور جھاڑیوں سے بچتا

ہوا پوری رفتار کے ساتھ مندر کی طرف بھاگنے لگا۔ جھیل کے کنارے مینڈکوں

اور جھینگروں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ لیکن مادھو کے کان صرف ایک آواز

سن رہے تھے اور وہ مندر کی گھنٹی کی آواز تھی۔ گھنٹی پر بہت ہی ضرب اس کے دل

کی دھڑکن اور قدموں کی رفتار میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے بار بار

یہ فقرہ دہرا رہا تھا۔ میں بھگوان کا اوتار بنوں گا..... میں بھگوان کا اوتار بنوں گا؟

(۲)

مندرجہ ذیل سے کچھ فاصلے پر مادھو کا اور تھوڑی دیر سانس لینے کے بعد ادھر ادھر دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ پاؤں اٹھانے لگا۔ مندر کے دروازوں سے انہوں کی روشنی نظر آتے ہی اس نے محسوس کیا کہ مندر کے نگہبانوں کی خوفناک آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔ آسمان پر بادل کی سیاہ چادر کہیں کہیں پھٹ چکی تھی اور تارے نظر آ رہے تھے۔ مادھو کھلی فضا سے ہٹ کر درختوں کے تاریک سائے میں کھڑا ہو گیا۔ مندر کی گھنٹی بند ہو چکی تھی اور اندر کوئی بھیجن گارہا تھا۔ مادھو بھیجن کے الفاظ اچھی طرح دُسن سکا۔ وہ جھجکتا ہوا آگے بڑھا اور سب سے آخری درخت کے نیچے پہنچ گیا جو مندر کے برآمدے سے کوئی بیس قدم دور تھا۔ بھیجن کے الفاظ اب اسے صاف طور پر سنائی دینے لگے۔ مندر کے دروازے سے اسے چند آدمیوں کی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے جھک کر دیکھا چار آدمی پچھلی دیوار کی طرف منہ کیے ایک مورتی کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک بھیجن کا رہا تھا، مادھو اس کے ساتھ ساتھ بھیجن کے الفاظ دہراتا رہا۔ بھیجن ختم ہوا اور چاروں پجاری باہر نکل آئے۔ مادھو چاروں کی دھیمی روشنی میں کسی کو نہ پہچان سکا تاہم دو آدمیوں کے متعلق اسے شک ہوا کہ یہ مندر کے پرانے نگہبان ہیں۔ ایک نے کہا "پرودھت جی! اندھیرا ہے میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں؟" پرودھت نے جواب دیا "اور پھر تیس یہاں چھوڑنے کے لیے کوئی ایسا؟"

دوسرا بولا "ٹھیک ہے پرودھت جی! شکر بھوتوں سے بہت ڈرتا ہے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

پرودھت نے پھر جواب دیا "شکر ڈرتا ہے لیکن میں نہیں ڈرتا میں اکیلا جاؤں گا۔ تم دونوں جھونٹ جی کی سیوا میں رہو۔" پرودھت یہ کہہ کر ایک پست قامت آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں۔"

پست قامت آدمی نے جواب دیا "نہیں! مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں" "مورتی کب تک تیار ہو جائے گی؟"

"بس اب تھوڑا سا کام رہتا ہے کوئی دو ہفتے لگیں گے۔"

"اچھا! نسکار۔" اس کے جواب میں نسکار کی تین آوازیں آئیں۔

پرودھت کو آم کے درخت کے قریب سے گزرتا دیکھ کر مادھو دم بخود سا ہو کر درخت کے ساتھ چھٹ گیا۔ باقی تینوں مندر کے صحن کی ایک طرف چار پائیلوں پر لیٹ گئے۔

شکر نے سوال کیا "آپ نے اب تک کتنی مورتیاں بنائی ہیں؟"

پست قامت آدمی نے جواب دیا "کوئی دوسو۔"

"بھلا آپ کالی دیوی کی مورتی بھی بنا سکتے ہیں؟"

"رام نگر کے مندر میں کالی دیوی کی مورتی میں نے ہی تو بنائی تھی۔ راجہ نے مجھے ایک ہاتھی انعام دیا تھا۔"

"ہاتھی! اسے آپ کیا کرتے ہوں گے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ مفت کی معیبت تھی۔ میں نے پرودھت کو دے دیا تھا۔"

گوپال نے کہا "رام نگر میں کالی دیوی کا مندر بہت مشہور ہے۔ کتنے میں وہاں ہر سال کئی آدمیوں کا بلیاں دیا جاتا ہے۔"

”ہاں پہلے دن سات شودروں کا بلیدان دیا گیا تھا۔“

شکر نے کہا ”اب تک یہاں کالی دیوی کا مندر سونا پڑا ہے اور شودروں کی نسل اس قدر بڑھ رہی ہے کہ اگر ہر روز بلیدان دیا جائے تو بھی ختم نہ ہوں۔“

مورتی کے سامنے کبھی کبھی پشودان دیا جاتا ہے اور بس۔“  
ٹھٹھکنے قد کے آدمی نے کہا ”میں نے سنا ہے کہ تمارا سردار شودروں پر بہت مہربان ہے؟“

شکر نے جواب دیا ”جیساراجہ ویسا سردار۔ بڑے پروہت نے کئی بار راجہ سے اس کی شکایت کی ہے لیکن وہ سنتا ہی نہیں۔“  
”تو پھر یہ راجہ دیر تک نہیں رہے گا۔“

”آپ کو کیا تاؤں! یہاں تو اچھوت اس قدر سرچڑھ گئے ہیں کہ ہم تنگ آ گئے ہیں۔ وہ جھیلوں میں نہاتے ہیں۔ دریا میں مچھلیاں پکڑتے ہیں اور اگر راہ چلتے کہیں ان کا سامنا ہو جائے تو محال کیا کرنا راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو جاتے ہیں خود ہٹنا پڑتا ہے۔“

گوپال نے کہا ”جوت جی! اس میں نہ راجہ کا قصور ہے اور نہ سردار کا۔ یہ علاقہ قسطنطنیہ کے عیسائیوں کے ہاتھ میں تھا۔ شروع شروع میں ان کے ساتھ سختی کی گئی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ دُور دُور کے پہاڑوں میں چھپ چھپ کر ہمارے ساتھ جنگ کرتے رہے۔ راجہ کی فوجوں کا بہت نقصان ہوا۔ پہلے سردار نے ان پر سختیاں کر کے وہ کامیابی حاصل نہیں کی جو رام داس نے نرمی سے حاصل کی ہے۔ انہوں نے شودروں کا سا سلوک کرنے سے پہلے انہیں شور و بنا لینا ضروری سمجھا۔ سردار رام داس کے سلوک سے یہ لوگ اب بھول چکے ہیں کہ یہ ہمارے غلام ہیں اور ابستہ ابستہ شور مچاتے جا رہے ہیں لیکن ابھی تک ان میں کسی حد

تک بغاوت کا جذبہ موجود ہے۔ اگر آج ہی ہم ان کے ساتھ سختی شروع کر دیں تو وہ ہمیں دشمن سمجھ کر اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ کیا دشمن کو جگا کر اس کے خلاف جنگ کرنے کی بجائے اسے سدا کر اس کا گلا گھونٹ دینا آسان نہیں؟“

”تم درست کہتے ہو۔ پست قد کے آدمی نے جواب دیا۔  
”شکر! سو گئے؟“ گوپال نے پوچھا۔

شکر گوپال کی باتوں سے عام طور پر نیند آ جاتا کرتی تھی۔ وہ حسد اٹھ لے رہا تھا۔

اس گفتگو نے مادھو کی کتاب زندگی کا ایک نیا ورق الٹ دیا۔ دنیا اس کے سامنے ایک وسیع جھیل تھی۔ جہاں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل رہی تھیں اس نے محسوس کیا کہ لوگ دنیا میں بھگو ان کی مرضی پوری کرنے کی بجائے اس کے نام کی آڑ لے کر دنیا کے کمزور انسانوں پر ایک دائمی تسلط قائم کرنا چاہتے ہیں۔ سب کو بنانے والا بھگو ان ایک پر مہربان اور دوسرے کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ کیا اس کے بادل سب پر نہیں برستے۔ اس کی ہوائیں سب تک نہیں پہنچتی کیا اس کا سوچ سب کو روشنی نہیں پہنچاتا اور اس کی زمین سب کے لیے اناج اور پھل کے خزانے نہیں اگلتی۔ بھگو ان برا نہیں، وہ ہمارا دشمن نہیں۔ یہ لوگ تلواروں اور نیزوں کے علاوہ مگر وہ ذریعہ کے خوفناک ہتھیاروں سے مسلح ہیں لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم ان کے گھوڑوں اور ہاتھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور ان کے سامنے ہاتھ پھیلا سکتے ہیں۔ میں بھگو ان کی پوجا کروں گا میں بھگو ان کا اوتار بنوں گا۔“

مادھو دیر تک وہاں کھڑا رہا اور جب اسے اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ مندر کے نگہبان سوچکے ہیں تو وہ زمین پر ہاتھ ٹیک کر ایک چوپائے کی طرح ابستہ ابستہ

چلتا ہوا مندر کی طرف بڑھا۔ برائے میں ایک پتھر کی نامکمل مورتی اور ان اقداروں پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اور مندر میں داخل ہو کر جھگوان کی مورتی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دینی زبان سے کہہ رہا تھا:

”بھگوان! میں تیرا دھارمنا چاہتا ہوں۔ کیا تو شوروں سے نفرت کرتا ہے۔ کیا تو نے ہمیں نہیں بنایا؟ بھگوان! بھگوان!!“  
 مادھو مورتی کے پاؤں پر گر کر سسکیاں لینے لگا۔

باہر روخت پر چگا وڑ کے پھر پھرانے کی آمہٹ سن کر ماوصوف زود  
 ہو کر اٹھا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ مندر کے نگہبانوں کے خراٹے  
 ان کی بے خبری کا پتہ دے رہے تھے۔ ماوصو واپس مڑ کر پھر مورتی کی طرف متوجہ ہوا  
 اور وہی زبان میں کہنے لگا: بھگوان! تیرے مندر کے دروازے میرے لیے بند ہیں  
 لیکن میں تیری پر جا کر ناجاہتا ہوں۔ تیرا اوتار بننا چاہتا ہوں۔ اگر تیرے بھاری میرا  
 راستہ نہ روکتے تو میں ہر روز یہاں آتا۔ تجھے ہنسری سنا تا۔ تیرے لیے بھجن گا تا۔  
 جھیل کے صاف پانی سے کنول کے بڑے بڑے پھول لاکر تیرے پاؤں میں ڈھیر  
 کرتا۔ یہاں تک کہ کر ماوصو کو ایک خیال آیا۔ اور اس کے دل میں مسرت کی لہریں اٹھنے  
 لگیں۔ تیرے ہاتھ چکنی مٹی کی مورتی بنا سکتے ہیں۔ کیا تو ایک پتھر کی مورتی نہیں تراش  
 سکتا؟

اس کی نگاہیں بھگوان کی مورتی کا طول و عرض ناپنے لگیں اور اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ مورتی کے جسم پر پھرنے لگے۔

”لیکن سفید پتھر؟“ اس نے اپنے دل سے سوال کیا اور تھوڑی دیر سمجھنے کے بعد اس نے خود ہی جواب دیا: ”دریا بہت ہیں“

(۴)

صبح کے وقت مندر کے برآمدے میں نامکمل مودتی کے پاس پڑے ہوئے سنگ تراشی کے بہت سے اوزار غائب تھے ٹھکنے سنگ تراش نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ ہتھوڑا میں نے دلی سے خریدا تھا۔ وہ تیشہ میں نے بنارس سے لیا تھا۔ اور فلاں فلاں اوزار میں نے فلاں فلاں جگہ سے لیے تھے اب مجھے پھر ارم گرجا جانا پڑے گا۔ وہاں ہی بھگو ان کی! اسے بھگو ان کے مندر میں چوری!!

دوسری طرف شنکر، گوپال کو اور گوپال شنکر کو بڑا بھلا کدرا تھا، تم ایک گدھے کی نیند سوتے ہو؟

”تمہارے خراٹوں سے مینڈک کی سی آواز نکلتی ہے۔“

بالآخر دونوں نے فیصلہ کیا کہ رات کے وقت یہاں کوئی نہیں آیا۔  
ٹھکنے سنگ تراش نے غصے سے اڑبیاں اور اٹھاتے دانت پیستے اور  
اپنے سر کو دو ہتر مارتے ہوئے کہا: ضرور آیا ہے۔ شام تک میرے اوزار یہیں تھے  
اگر کوئی نہیں آیا تو میرے چور تم ہو میں پروہت کے پاس جاؤں گا میں سردار کے  
پاس جاؤں گا۔ میں راجہ کے پاس جاؤں گا۔ ... میں ... میں ...  
گوپال اور شنکر حیران تھے کہ وہی ہے جو دو سروں کو ہاتھی دان کیا کرتا ہے!  
دوپہر کے وقت شہر میں سردار رام واس کے سامنے پروہت، شنکر گوپال  
اور سنگ تراش اپنی بدحواسیوں کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

سنگ ترازش اپنی کھوئی ہوئی دولت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شکر شو ریل کے خلاف حکومت کی طرف سے سخت کارروائی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ پروہت اپنے مندر کے سچاریوں کو بچانا چاہتا تھا۔ رام داس کو حکومت

کی بھنا می کا خوف تھا وہ شوروں کے متعلق شکر کی باتوں سے پیدا ہونے والے  
شکر کو رفع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

گوپال اب تک خاموش کھڑا تھا۔ رام داس نے پوچھا: کیوں گوپال اتنا ہلکا  
کیا خیال ہے؟

گوپال اس واقعہ پر شکر اور پروہت کی طرح پریشان نہ تھا۔ مندر میں چوری  
بے شک ایک بڑا فعل تھا لیکن گوپال کو اس بات کی خوشی تھی کہ سنگ تراش کو  
ہاتھی دان کرنے کے متعلق گفتیں بانگنے کی سزا ملی ہے اب اس کے لیے سنگ تراش  
سے تمام گالیوں کا بدلہ لینے کا موقع تھا اس نے جواب دیا: بھگوان نے جو عمل  
آپ کو دی ہے ہم اس تک نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ جو کچھ بھگوان  
کی مرضی سے ہوا۔ بھگوان چور بھی بھیج سکتا ہے اور دھرتی ماما کو بھی اس کے  
اوزار غائب کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ میرا خیال ہے اس کے اوزار دھرتی ماما  
نے غائب کیے ہیں شاید اس لیے کہ جو مورتی یہ بنانا چاہتا ہے وہ بھگوان کو پسند  
نہ تھی اور یا شاید اس لیے کہ اس نے بھگوان کے مندر میں ہم سے بہت جھوٹ بولا  
تھا اور اسے اس جھوٹ کی سزا ملی ہے۔

سنگ تراش نے آپ سے باہر ہوتے ہوئے کہا: جھوٹ! جھوٹ!!  
اے پانی! میں نے تم سے کیا جھوٹ بولا؟

گوپال نے جواب دیا: ٹھہرو! میں بتاتا ہوں۔ ہاں پروہت جی! میں آپ  
سے ایک بات پوچھتا ہوں اس کی عمر کیا ہوگی؟

پروہت نے سنگ تراش کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا: کوئی  
ساتھ برس؟

سنگ تراش نے بگڑ کر کہا: ساتھ نہیں پچاس بلکہ دو بیسے کم۔

گوپال نے پروہت سے دوسرا سوال کیا: کیوں پروہت جی! رام جی  
کالی دیوی کا مندر کب بنا تھا؟

پروہت نے جواب دیا: اسنے صدیاں ہو گئیں۔  
"اور مورتی کو؟"

"وہ بھی بہت پرانی ہے۔"

یہ کہتا ہے کہ کالی دیوی کی مورتی میں نے بنائی ہے اور اسے ایک ہاتھی انعام  
ملا تھا۔

یہ کہتا ہے، یہ کہتا ہے، سنگ تراش نے آپ سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔  
گوپال نے کہا: مہاراج! آپ شکر سے پوچھ لیجئے۔

رام داس نے پوچھا: کیوں شکر؟

عام حالات میں شکر گوپال کی تائید میں کبھی گواہی نہ دیتا لیکن اس کے دل  
پر سنگ تراش کی گالیوں کے زخم ابھی تازہ تھے۔ اس نے جواب دیا: "صرف تم  
کی کالی دیوی ہی نہیں سرکار یہ تو کہتا تھا کہ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے  
مندروں کی مورتیاں میں نے بنائی ہیں اور راجوں اور مہاراجوں نے مجھے اتنے ہاتھی  
دیے ہیں کہ میرے گھر انہیں باندھنے کی جگہ نہیں اور میں نے انہیں ہندوستان کے  
تمام بڑے بڑے پروہتوں کو دان کر دیا ہے۔"

اب پروہت کی باری تھی اس نے ہنستے ہوئے کہا: "مجھے تو اس نے بڑی  
کا بچہ بھی نہیں دیا۔"

سنگ تراش کی ایڑیاں زمین سے اٹھ چکی تھیں اور اس کا جسم غصے سے  
کانپ رہا تھا اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: میرا پاپ ہے! یہ اندھیر ہے!  
میرے اوزار ان بد معاشوں نے ہی چرلے ہیں میں ان سے بدلہ لوں گا میں راجہ

کے پاس جاؤں گا۔  
 رام داس نے اپنی جیب سے سوئے کے تین سکے نکالتے ہوئے سنگ تراش  
 کے سامنے پھینک دیے اور کہا: یہ لو! اور بھاگو یہاں سے۔ ہمیں تمہاری بنائی  
 ہوئی مورتی کی بھی ضرورت نہیں۔  
 سنگ تراش نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سکے اٹھائے اور باہر نکلا۔  
 پروہت، شکر اور گوپال کے سر سے گویا بلا لگئی۔  
 مندر کی طرف واپس جلتے ہوئے گوپال نے شکر سے کہا: شاباش بیٹا!  
 جھوٹ بولنا تمہارا ہی حصہ ہے۔ خوب گت بناتی اس آلو کی!

شام کے وقت رام داس نے گوپال کو بلا بھیجا۔ جب وہ شہر سے واپس  
 آیا تو اس کے ساتھ ایک گائے تھی اس نے شکر کو دور سے آواز دی: بیٹا  
 شکر! سردار نے مجھے دان کیا ہے۔ تم دو دو اور مکھن میں میرے حصہ والے  
 صرف گھاس لانا پڑے گی۔  
 شکر کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔

(۳)

شام کے وقت ارجن نے کھانا کھاتے ہوئے ساوتری سے کہا: تم  
 سنا گزشتہ رات کسی نے مندر سے سنگ تراش کے اوزار چرائیے ہیں!  
 ساوتری نے حیران ہو کر کہا: بھگوان کے مندر میں چوری! بھلا ایسا پاپ  
 کون کر سکتا ہے؟  
 یہ کسی شور کا کام ہو سکتا ہے۔

موہنی کا ماتھا ٹھنکا وہ ارجن کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی: پتا چلی  
 چور کا کچھ پتہ نہیں لگا؟  
 ”بیٹی تلاش ہو رہی ہے اگر چور پکڑا گیا تو بہت بڑی سزا دی جائے  
 گی اسے۔“

”کیسی سزا پتا چلی؟“

”میرے خیال میں اس کا بلیدان دیا جائے گا۔“

”اگر کوئی اونچی ذات کا ہو تو بھی؟“

”پگلی کہیں کی۔ بھلا اونچی ذات کا آدمی مندر میں چوری کر سکتا ہے؟ یہ کسی  
 شور کا کام ہے۔“

موہنی خاموش ہو گئی اور ارجن اور ساوتری کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد سو  
 گئے۔ موہنی دیر تک جاگتی رہی اسے بار بار مادھو کا خیال آ رہا تھا اور وہ ہر بار اپنے  
 دل کو یہ کہہ کر تسلی دے رہی تھی کہ مادھو ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ ہرگز ایسا نہیں کر  
 سکتا۔ بھگوان کرے کہ اس نے ایسا نہ کیا ہو۔ ادھی رات کے بعد نیند نے  
 اس کے خیالات سنہنوی میں تبدیل کر دیے۔ وہ جمیل کے کنارے مادھو  
 سے باتیں کر رہی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا: موہنی میں ایک بہت بڑا بھگوان بنا رہا ہوں۔ بالکل تمہارا  
 بھگوان جیسا۔ مجھے پتہ ترشنے کے اوزار مل گئے ہیں۔  
 اور وہ کہہ رہی تھی: مادھو! یہ اوزار چھپا دو۔ وہ تمہیں پکڑ کر لے جائیں گے  
 اور تمہارا بلیدان دیا جائے گا۔

جھاڑوں میں سے سردار کے سپاہی نمودار ہوئے۔ اور مادھو کو پکڑ کر لے  
 گئے۔ موہنی ان کی مفتیں کر رہی تھی۔ اسے چھوڑ دو اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ

اسے کالی دیوی کی مورتی کے سامنے لے گئے۔ کالی دیوی کی خوفناک شکل دیکھ کر موہنی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

ساتویں گھبرا کر اٹھی اور اس نے آواز دی "کیا ہے موہنی؟"

موہنی نے خوف سے کانپتے ہوئے جواب دیا "کچھ نہیں ماما!"

بیٹی ڈر گئی ہے تو اگر میرے پاس لیٹ جاؤ۔

موہنی نے جواب دیا نہیں ماما۔ اب صبح ہو رہی ہے۔ میں بھگوان کی پوجا کروں گی۔

ارجن کے مکان کا ایک کمرہ پوجا پاٹ کے لیے وقف تھا۔ موہنی اٹھی اور ہاتھ منہ دھو کر سنگ مرمر کی ایک مورتی کے سامنے ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی اس نے میٹھی آواز میں چند بھجن گائے اور پھر وہ بھرے دل سے دعا کی "بھگوان تو جانتا ہے کہ وہ بے قصور ہے۔ اسے تیرا نام بھی معلوم نہ تھا۔ یہ سب کچھ ہم نے اسے بتایا ہم نے اسے مندر کا راستہ دکھایا۔ بھگوان! وہ سچے دل سے تجھ سے پریم کرتا ہے اور تجھ سے پریم کرنا پاپ نہیں۔ کیا تو نے اسے پیدا نہیں کیا؟ وہ جس دماغ سے تیرے متعلق سوچتا ہے جن ہاتھوں سے تیری مورتیاں بناتا ہے۔ جس زبان سے تیرے لیے بھجن گاتا ہے اور جس دل سے تجھے پریم کرتا ہے۔ سب تیرے بنائے ہوئے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تو اپنے بنائے ہوئے انسانوں کے پریم کا جواب نفرت سے دے اور پھر اس کی صورت بھی تو ایسی نہیں کہ اسے بنانے والا اس سے نفرت کر سکے۔"

موہنی کی آنکھوں میں مادھو کی صورت پھرنے لگی۔ اس نے صبح کی دھندلی روشنی میں مورتی کی طرف دیکھا اور مادھو کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے لگی۔ سنگ مرمر کی بے جان مورتی میں ایک پراسرار مہبت کے سوا کچھ نہ تھا اس کے مقابلے

میں مادھو کے خدو خال کی رعنائی اور دل فریبی کہیں زیادہ تھی۔ مورتی کی بے حس اور پرسکون آنکھوں کے مقابلے میں اسے مادھو کی سیاہ اور چمک دار آنکھوں کی گہرائی میں زندگی کی ایک خوش گوار جھلک نظر آئی۔ بار بار التجاؤں کے جواب میں مورتی کی پراسرار خاموشی پر اس کا دل بیٹھ چکا تھا۔ اس کی گرم اور تیز سانس ٹھنڈی آنکھوں میں تبدیل ہو چکی تھی لیکن مادھو کے تصور نے اس کی مردہ رگوں میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔

وہ اس مقدس مورتی کے چہرے سے دوران دل فریب فضاؤں میں پڑا کر رہی تھی جہاں پانی میں لہریں اٹھتی تھیں۔ پھول کھلتے تھے، درخت جھومتے تھے اور بنسری کے سروں سے تانیں نکلتی تھیں جہاں زندگی اپنی تمام رنگینوں کے ساتھ موجود تھی۔ جہاں ہر سطح کے نیچے ایک گہرائی تھی۔ وہ گہرائی جس میں غوطہ لگانے والے کبھی نہیں تھکتے۔ یہ مورتی اپنی عظمت اور تقدیس کے باوجود ایک چمکتی ہوئی سفید سطح کے سوا کچھ نہ تھی۔ اپنی پوجارن کی آنکھوں میں تشنگی، اس کی آواز میں سوز اور اس کے دل میں تڑپ پیدا کرنے سے معذور تھی۔ موہنی نے بار بار اپنے منتشر خیالات کو سمیٹ کر بھگوان کی مقدس مورتی کو اپنی توجہ کا مرکز بنانے کی کوشش کی لیکن اسے اپنی بے بسی کا اعتراف کرنا پڑا اس نے بھگوان کی مورتی کے پاؤں میں سر رکھتے ہوئے کہا۔

"بھگوان! میری رکشا کرو۔ وہ ایک شورور ہے مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میں اس سے دُور رہنا چاہتی ہوں۔ میں حسیل پر کبھی نہ جاؤں گی۔ اسے سزا ملنے پر مجھے کبھی دکھ نہ ہو گا۔"

مادھو کی صورت پھر اس کی آنکھوں میں پھرنے لگی۔ اس کی بنسری کی تانیں پھر اس کے کانوں میں گونجنے لگیں وہ پوچھ رہا تھا۔ موہنی تمہیں سچ مجھ میرے ساتھ

کوئی ہمدردی نہیں اگر میرا بلیدان دیا گیا تو؟  
 موہنی نے گہرا کمر اٹھایا اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ اس نے  
 سسکیاں لیتے ہوئے کہا: "بھگوان! میں نے جھوٹ بولا۔ میں نے جھوٹ بولا  
 میں بے بس ہوں اور وہ بے تصور ہے۔ وہ صرف تیری پوجا کرنا چاہتا ہے۔ اگر  
 تو سچ بھگوان ہے تو اس کی مدد کر۔"

یہاں تک کہنے کے بعد موہنی اچانک گہرا اٹھتی۔ اس کے دل نے احتجاج  
 کیا۔ سچ بھگوان! یہ کیا کہہ رہی ہے تو۔ "کیا تجھے اس کے بھگوان ہونے میں  
 شک ہے؟"

موہنی فوراً اس سوال کا جواب نہ دے سکی وہ ٹمکنی بازو کر مورتی کی طرف دیکھنے  
 لگی۔ صبح کی برصحتی ہوئی روشنی میں اس کے چہرے کی ہیبت کم ہو رہی تھی۔  
 کیا یہ مورتی۔ یہ تراشا ہوا پتھر بھگوان ہو سکتا ہے۔! کیا یہ تمہاری آؤٹو  
 سکتا ہے؟ تمہارے دل کے بھید جان سکتا ہے؟.... کیا اس نے ساری دنیا  
 کو بنایا ہے؟

موہنی ان سوالات کا جواب سوچنے سے گھبراتی تھی۔ وہ انتہائی پریشانی  
 کی حالت میں کمرے سے باہر نکلی۔ صحن میں آم کے درخت پر ایک کوئل "کوہو کوہو"  
 کے نغمے الاپ رہی تھی۔ ارجن باہر جا چکا تھا اور ساوتری گائے کا دودھ دوہ  
 رہی تھی۔

موہنی دیر تک خاموش کھڑی کوئل کے نغمے سنتی رہی اور اس کے خیالات پھر  
 ایک بار جھیل کے کنارے گھنے درختوں میں چکر لگانے لگے اور وہ خود فراموشی کی حالت  
 میں آہستہ آہستہ کوئل کی کوہو کا جواب دینے لگی۔

ساوتری نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا "آج تجھے بھگوان کی پوجا کرتے دیکھ

کر تیرے پتا جی بہت خوش ہوئے۔ تیرا سر بھگوان کے قدموں میں دیکھ کر انہوں نے  
 کہا۔ میری بیٹی! اب سیانی ہو گئی ہے۔ بیٹی رات کیا خواب دیکھا تھا تو نے؟  
 "ماتا مجھے یاد نہیں مجھے کسی بات سے ڈر لگا تھا۔"

باہر کے دروازہ سے رندھیر نے دو تین مرتبہ اندر جھانکا لیکن جیب موہنی  
 اس کی طرف متوجہ نہ ہوتی تو وہ اندر چلا آیا۔ اس نے کہا "موہنی چیتے کا بچہ دیکھو گی؟  
 کہاں؟"

"ہمارے گھر ایک شکاری رات کو پکڑ لایا تھا۔"

ساوتری نے کہا "بیٹی! دودھ پی کر جانا۔"

موہنی رندھیر سے تنہائی میں کچھ کہنے کے لیے بے قرار تھی وہ بولی میں ابھی  
 آتی ہوں ماما!

مکان سے باہر نکل کر موہنی نے رندھیر کی طرف مغموم نگاہوں سے دیکھا  
 رندھیر موہنی کے چہرے سے اس کے تاثرات کا اندازہ لگانے کا عادی تھا۔  
 اس نے پوچھا۔ موہنی تم کچھ اُداس سی ہو کیا بات ہے؟

"رندھیر میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں خفا تو نہ ہو جاؤ گے؟"

"میں اور تم سے خفا! کہو کیا ہے؟"

"تم نے مندر کی چوری کے متعلق سنا؟"

"جب پُجاری اور پودھت شکایت لے کر آئے میں گھر پر تھا۔"

"رندھیر اگر چور پکڑا گیا تو کیا تمہارے پتلے سزا دیں گے؟"

"ضرور دیں گے۔ مندر کے چور کو کون معاف کر سکتا ہے؟"

موہنی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: "رندھیر! اگر یہ اور کسی نے بھگوان کی  
 مورتی تراش کر اس کی پوجا کرنے کے لیے چرائے ہوں تو بھی اسے سزا ملے گی۔"

زندھیر نے حیران ہو کر کہا: "مومنہ! تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"  
مومنہ بولی: "زندھیر تمہیں یاد ہے مادھو کو بھگو ان کی مورتی بنانے کا شوق  
تھا!"

زندھیر گہری سوچ میں مومنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ مومنہ پھر بولی: "زندھیر! اگر  
ہم اسے اس دن مندر میں نہ لے جاتے تو یہ بات یہاں تک نہ پہنچتی۔ اب اسے  
بچانا ہمارا فرض ہے۔ اگر اس کے پاس کسی نے یہ اوزار دیکھ لیے تو وہ پکڑا جائیگا  
لیکن تم اسے بچا سکتے ہو۔ تم جھیل کی طرف جاؤ اس سے پوچھو اگر اس نے یہ اوزار  
پڑائے ہیں تو اس سے کہو کہ انہیں کہیں چھپائے۔"

اگر زندھیر کو ایک شورور کے ساتھ ہمدردی نہ بھی ہوتی تو بھی مومنہ کی اشارہ  
اس کے لیے حکم تھا اس نے مومنہ کی تسلی دیتے ہوئے کہا: "میں ابھی جاتا ہوں۔  
سے گھوڑا لے آؤں۔ چلو تم وہاں چلتا دیکھو میں ابھی واپس آجاؤں گا۔"  
مومنہ نے جواب دیا: "نہیں جب جھیل سے واپس آؤ گے تو مجھے اپنے  
ساتھ لے جانا۔"

(۵)

شاننا جھیل کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھی کنول کے پھول کی پتیاں توڑ  
توڑ کر پانی میں پھینک رہی تھی اس کے آس پاس بھیر بکریاں چر رہی تھیں۔ درختوں  
کے پیچھے سے بھاگتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپ سن کر بکریاں بدحواس ہو کر اس  
طرف دیکھنے اور بھیریں اپنی مادری زبان میں ایک دوسرے کو کچھ سمجھانے لگیں۔  
شاننا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ زندھیر کا گھوڑا درختوں کی آڑ سے نمودار ہوا اور بکریاں

اور بھیریں خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر منتشر ہو گئیں۔ سوار نے پوری طاقت سے گھوڑے  
کی لگام کھینچی لیکن سرکش گھوڑا رکتے رکتے پانی کے کنارے پہنچ گیا۔ شاننا خوفزدہ  
ہو کر پیچھے ہٹی۔ پتھر سے پاؤں مکرایا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی پیٹھ کے بل پانی میں جا گرا۔  
زندھیر نے گھوڑے سے اتر کر پانی میں چھلانگ لگا دی اور شاننا کا بازو  
پکڑ کر اُپر اٹھاتے ہوئے کہا: "مجھے بہت افسوس ہے کہ یہ گھوڑا بہت سرکش  
ہے میں پہلی بار اس پر سوار ہوا تھا تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

شاننا نے زندھیر جیسے خوش وضع نوجوان کو تصور میں بھی اپنے اس تند قریب  
نہ دیکھا تھا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے کے کئی رنگ بدلے۔ زندھیر کی طرف اس  
کی نگاہیں جھک جھک کر اٹھیں اور اٹھ اٹھ کر جھکیں۔ دل کی دھڑکن اور سانس  
کی رفتار کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوئی۔ پانی سے باہر نکل کر زندھیر نے اس کا بازو پھینک  
دیا اور پھر تسلی دیتے ہوئے کہا: "تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

شاننا نے مسکراتے ہوئے شمش کرتے ہوئے جواب دیا: "نہیں، آپ  
خواہ مخواہ پانی میں کود پڑے۔"

زندھیر ایک اچھوت کو چھو چکا تھا۔ اس کا مسکراتا ہوا منہ بھولنے والا  
چہرہ دیکھ چکا تھا۔ اس کی آواز کانوں کے پر سے چیرتی ہوئی اس کے دل کی آخری  
گہرائیوں تک پہنچ چکی تھی۔ تاہم ندامت سے زیادہ وہ اپنے دل کی دھڑکن کو محسوس  
کر رہا تھا۔

شاننا! "جواب دینے کی بجائے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے پہلی بار اپنے  
نام میں کوئی غہنی نظر آئی۔ وہ بار بار زندھیر کے منہ سے اپنا نام سننا چاہتی تھی۔  
زندھیر نے پھر کہا: "شاننا! تمہارا نام شاننا ہے نا؟"  
شاننا نے اثبات میں سر ہلایا۔

”دیکھو شانتا! میں ایک ضروری کام کے لیے آیا ہوں تمہارا بھائی کہاں ہے؟“  
 شانتا نے جواب دیا: ”وہ... لیکن اس نے کہا تمہاری کسی کو اس کا  
 پتہ نہ بتاؤں۔“

شانتا نے کہنے کے بعد غیر ارادی طور پر اپنے دائیں طرف گھنے درختوں کو  
 دیکھنے لگی۔

”اس نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں آؤں تو بھی اس کا پتہ نہ بتانا؟“  
 ”نہیں! آپ کو اور موتی کو تو وہ بہت یاد کرتا ہے۔“  
 ”تو پھر تم مجھے اس کا پتہ نہ بتاؤ گی؟“  
 شانتا سوچ میں پڑ گئی۔

زندہ ہیر نے مسکراتے ہوئے کہا: ”اچھا نہ بتاؤ مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہے؟“  
 ”نہیں! تم نہیں جانتے۔“ شانتا مسکراتے ہوئے پھر گھنے درختوں کی  
 طرف دیکھنے لگی۔

زندہ ہیر نے کہا: ”وہ ان درختوں میں چھپا ہوا ہے۔“  
 شانتا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”اور تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“  
 ”چھاپا دھو شکار کے لیے گیا ہوا ہے اور آج میں اور بھیا بکریاں چرا رہی  
 ہیں۔ آپ کسی کو بتائیں نہیں۔ بتایا ان درختوں میں چھپ کر پتھر کاٹ رہا ہے  
 میں اسے بلاتی ہوں۔“

نہیں، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

زندہ ہیر نے ایک درخت کے ساتھ گھوڑا باندھا اور شانتا کے ساتھ  
 مادھو کی تلاش میں چل دیا۔ گھنے درختوں کی آپس میں پھنسی ہوئی ٹہنیوں اور

ان کے نیچے جھکی سیلوں کی وجہ سے آگے بڑھنے کا راستہ ذرا دشوار تھا۔ زندہ ہیر  
 اور شانتا نے سخت جدوجہد کے بعد کچھ فاصلہ طے کیا۔ زندہ ہیر نے پوچھا: ”میں کتنی  
 دور اور آگے جانا پڑے گا؟“

”بس جتنا ہم آگے ہیں اس سے ذرا زیادہ۔“  
 ”یہاں تو سانپ بھی ہوتے ہوں گے؟“

شانتا نے جواب دیا: ”سانپ بہت ہیں یہاں۔ آج ہی بھیا نے ایک کالا  
 سانپ مارا تھا ابھی آگے چل کر آپ کو دکھاتی ہوں۔ میں نے خود کئی سانپ  
 مارے ہیں۔“

زندہ ہیر فطرتاً بہت بہادر تھا لیکن سماج کی تربیت اس کے دل میں سانپ  
 کی دشمنی سے زیادہ اس کا خوف و احترام پیدا کر چکی تھی۔ وہ قدرے خوف زدہ  
 ہو کر شانتا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ تھوڑی دور چل کر اس نے ایک درخت کی  
 ٹہنی توڑ کر ہاتھ میں پکڑ لی اور کہا: ”ہلو! اب کوئی خطرہ نہیں۔“

شانتا نے کہا: ”میں تو سانپ کو ہاتھ سے پکڑ کر مار دیا کرتی ہوں۔ یہ ایک  
 جھوٹ تھا لیکن شانتا کو یقین تھا کہ اگر آج سانپ نکل آئے تو وہ زندہ ہیر کو  
 اپنی بہادری دکھانے یا اس کی حفاظت کے لیے ایسے اقدام سے جھجک محسوس  
 نہ کرے گی۔ ایک جگہ چند پتھروں کے درمیان ایک مردہ سانپ دیکھ کر یہ تھوڑی  
 دیر کے لیے رک گئے اور انہیں پتھر پر تیشے کی ضربوں کی آہٹ سناتی مینے لگی۔  
 شانتا نے کہا: ”بس اب ہم پہنچ گئے۔“

تھوڑی دور اور آگے چلنے پر تیشے کی ٹھکا ٹھک ایک لمخت بند ہو گئی شانتا  
 نے زندہ ہیر کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا: ”بھیا کو ڈرامیں تم شور نہ کرو۔“  
 شانتا احتیاط سے درختوں کی ٹہنیاں ادھر ادھر بٹاتی ہوئی آگے بڑھی

اور زنجیر اس کی سادگی پر مسکراتا ہوا بچے ہو گیا۔

ایک تناور درخت کے نیچے پہنچ کر شاننا حیران سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی کسی نے درخت کے نیچے بیل اور گھاس کاٹ کر تھوڑی سی جگہ بیٹھنے کے قابل بنا رکھی تھی۔ تراشے ہوئے پتھر کے چند ٹکڑے وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ شاننا نے بدحواس ہو کر زنجیر اور زنجیر نے پریشان سا ہو کر شاننا کی طرف دیکھا۔

بالآخر شاننا بولی۔ وہ یہیں تھا یہ کہہ کر شاننا زور سے آوازیں دینے لگی: "بھیا! بھیا! کہاں چلے گئے تم؟"

درخت کے اوپر سے ایک پُر زور تہقے کی آواز آئی۔ اور مادھو درخت کی ٹہنیوں سے کود کر ان کے سامنے اکھڑا ہوا۔

"موبنی بھی آئی ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

مادھو کے منہ سے موبنی کا نام زنجیر کو پسند نہ آیا۔ اس نے جواب دیا ہنسی یہاں آکر کیا کرتی؟

مادھو نے کہا: "آپ نے یہاں آکر بڑی دنیا کی مجھے یہ امید تھی کہ آپ ایسی جگہ مجھے تلاش کریں گے۔"

زنجیر نے کہا: "مادھو! میں تم سے ایک ضروری بات کہنے آیا تھا۔"

"کیسے؟"

"تم ابھی یہاں کیا کر رہے تھے؟"

مادھو نے پریشان ہو کر شاننا کی طرف دیکھا اس کی سہمی ہوئی نگاہیں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ اس کا بھید زنجیر پر ظاہر کر چکی ہے۔

زنجیر نے تسلی دیتے ہوئے جواب دیا: "ڈرو نہیں! تم جو کچھ کر رہے تھے، مجھے معلوم ہے۔۔۔۔۔ تم مورتی تراش رہے تھے اور پتھر تراشنے کے اوزار تم"

نے مندر سے لیے ہیں!

مادھو نے جواب دیا: "زنجیر! میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم خفا ہو جاؤ گے۔"

زنجیر نے کہا: "میں تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ تمہاری جان ہر وقت خطرے میں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے اور اسی لیے میں یہاں چھپ کر یہ کام کر رہا ہوں۔"

مادھو نے درخت کے قریب ایک بیل اٹھا کر ایک طرف کی اور بولا: "یہ دیکھو۔ میں نے تمہارے پاؤں کی آہٹ پاتے ہی یہ سب کچھ چھپا دیا تھا۔"

زنجیر نے بیل کے نیچے ایک پتھر اور سنگ تراشی کے اوزار دیکھ کر کہا: "تم بہت ہوشیار ہو موبنی کو تمہاری بہت فکر تھی اسی نے مجھے بھیجا تھا۔"

مادھو نے کہا: "زنجیر! میں حیران ہوں کہ تم اور موبنی شہر کے لوگوں سے کس قدر مختلف ہو، میں تمہارے احسان کا بدلہ کبھی نہ دے سکوں گا۔"

زنجیر نے جواب دیا: "مادھو! ہم بھی حیران ہیں کہ تم دونوں شکل و صورت سے اچھوت نظر نہیں آتے۔"

زنجیر کے ان الفاظ سے مادھو نے غلغلہ ہو کر سر جھکا لیا لیکن شاننا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

زنجیر نے کہا: "اچھا! اب میں جاتا ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"چلو، میں تمہیں جھیل تک چھوڑاؤں۔" مادھو نے پتھر اور اوزار پھر بیل کے نیچے چھپا دیے اور زنجیر اور شاننا کے آگے آگے چل دیا۔

جھیل کے کنارے گھوڑا دیکھ کر مادھو نے پوچھا: "یہ کون چھوڑ گیا؟"

"یہ میرا ہے۔" زنجیر نے جواب دیا۔

مادھو نے کہا "زندہ میرا جھیل میں نہاؤ گے نہیں؟"

زندہ میرا گھر پہنچنے کی جلدی تھی لیکن شانتا کی موجودگی نے مادھو کی درخوست کو قابل قبول بنا دیا۔ تھوڑی دیر بعد چھوت اور اچھوت ایک ہی جھیل کے پانی میں نہا رہے تھے۔ شہر کا بہترین تیراک ہونے کے باوجود زندہ میر کو مادھو قابل رشک نظر آ رہا تھا۔

جھیل سے نکلتے وقت دونوں نے کنول کے پھول توڑے۔ زندہ میر نے اپنے پھول شانتا کو پیش کیے۔ مادھو نے اپنے پھول زندہ میر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "تم میرے جاؤ۔ موتی کوٹے دینا۔ اسے کنول کے پھول بہت پسند ہیں۔"

مادھو کے منہ سے پھر ایک بار موتی کا نام سن کر زندہ میر نے ایک تلخی سی محسوس کی لیکن شانتا کے سامنے وہ اس کے پھول لینے سے انکار نہ کر سکا۔

(۶)

زندہ میر گھوڑا بھگاتا ہوا شہر میں داخل ہوا۔ موتی اپنے مکان سے باہر ایک درخت کے نیچے کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی وہ اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اترا اور موتی کو چھڑنے کی نیت سے منموم ساہوکر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ موتی کا چہرہ لیکا یک زد ہو چکا تھا۔

"کیا ہوا زندہ میر؟ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"موتی غضب ہو گیا وہ پکڑا گیا؟"

موتی دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی "زندہ میر اسے بچاؤ۔ بھگوان کے لیے اسے

بچاؤ وہ بے تصور ہے۔"

موتی کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

زندہ میر کھلمکھلا کر سنس پڑا۔ موتی سراپا التجا بن کر زندہ میر کے سامنے کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی،

"زندہ میر! بھگوان کے لیے مذاق نہ کرو۔ مجھے سچ سچ بتاؤ تم نے اسے دیکھا؟

"ہاں! تم اس کی فکر نہ کرو اسے کوئی خطرہ نہیں۔ چلو گھر چلیں۔"

"بتاؤ تو سہی کیا ہوا وہاں؟"

"زندہ میر نے جھیل کے تمام واقعات یکے بعد دیگرے بیان کرنے کے

بعد کہا "لو میر پھول۔"

موتی نے اس کے ہاتھ سے پھول لے لیے تو اس نے شرارت آمیز مسکرا

سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "موتی! تم بھر مشٹ ہو گئی ہو۔ یہ پھول مادھو

نے توڑے تھے۔"

موتی نے مسکرا کر جواب دیا "مجھے کیا معلوم کس نے توڑے ہیں۔ اگر وہ

اس نے توڑے ہیں تو بھی پاپ لا کر مینے دلے کے سر ہو گا؟"

## بدھو اور شکار

قریباً چار مہینے کنول اور بدھو کو مادھو کی دل چسپیوں کا علم نہ ہوا۔ سردی کے موسم میں جھیل کے اس پار لچھپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ کنا سے پرگھاس سوکھ چکی تھی۔ درختوں کے پتے جھڑ چکے تھے اور کنول کے پھول جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ لیکن مادھو دن میں ایک بار جھیل کی طرف ضرور جاتا۔

بدھو کو اپنی سادگی، ایشار اور خلوص کی بدولت اس پاس کی بستیوں کے لوگوں میں کافی عزت حاصل ہو چکی تھی۔ وہ ان کے ساتھ شکار کے لیے جاتا تو وہ اسے حتیٰ الوسع دریا کے ٹھنڈے پانی میں اتارنے سے منع کرتے اور اپنا شکار تقسیم کرتے وقت اس کا حصہ دوسروں سے زیادہ رکھتے۔ ان کے جھگڑوں میں بدھو کا فیصلہ آخری سمجھا جاتا۔

شکار کے موقعوں پر بدھو کی غیر حاضری میں بھیرٹوں کی نگہداشت شانتا اور مادھو کے سپرد ہوتی اور مادھو کو سنگ تراشی کے لیے سارا دن مل جاتا۔ لیکن کبھی کبھی بدھو اسے بھیرٹوں پر لانے اور مچھلیاں پکڑنے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا۔ بدھو کو اپنی زندگی میں مادھو کے سر کوئی ذمہ داری تھوہنا گوارا نہ تھا لیکن وہ اسے ایک اچھا چرواہا اور بہترین شکاری دیکھنا چاہتا تھا اس کے نزدیک ایک نوجوان کی سب سے بڑی خوبیاں یہی تھیں۔ ہنسری بجانے کے فن میں بدھو اس کے کمال کا اعتراف کر چکا تھا لیکن اسے یہ شکایت تھی کہ مادھو مچھلی کے

شکار اور بھیرٹوں پر لانے سے بہت جلد اکتا کر بھاگ جاتا ہے۔

ایک شام اس نے کنول سے کہا: "بہن! مادھو کا جی باہر بالکل نہیں لگتا۔ آخر وہ گھر میں سارا دن کیا کرتا رہتا ہے؟"

کنول نے حیران ہو کر جواب دیا: "گھر میں تو وہ شام سے پہلے کبھی نہیں آتا جس دن تم گھر چھوڑ جاتے ہو اس دن بھی وہ صبح سے شام تک کہیں غائب رہتا ہے۔"

"آخر کہاں جاتا ہے وہ؟"

"میں اسے ہمیشہ جھیل کی طرف آتے جاتے دیکھتی ہوں کبھی کبھی شانتا بھی اس کے ساتھ غائب ہو جاتی ہے۔ کیوں شانتا! کہاں جایا کرتے ہو تم دونو؟" شانتا نے جواب دیا: "کبھی بھی نہیں۔ جھیل پر راج ہنس کا ایک جوڑا رہتا ہے ہم انہیں دیکھا کرتے ہیں۔"

اتنے میں مادھو آ پہنچا اور اسے دیکھتے ہی بدھو نے کہا: "کیوں بیٹا! دیکھ آئے ہنس کا جوڑا؟"

مادھو نے پریشان ہو کر جواب دیا: "ہنس کا جوڑا؟ وہ کہاں ہے؟"

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"میں.... میں جھیل.... جھیل پر گیا تھا چچا!"

"جھیل پر تمہارا کیا کام تھا؟"

"چچا! میں وہاں ہنسری بجا رہا تھا۔ میں نے ایک نیا سر نکالا ہے۔"

سناؤں تمہیں؟"

"شانتا نے جلدی سے کہا: "سناؤ بھیا!"

مادھو نے ہنسری ہونٹوں سے لگائی اور ایک دردناک راگ نے بدھو

فاغصہ پیار میں تبدیل کر دیا۔ تاہم اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ مادھو اس سے کوئی بات چھپا رہا ہے۔ رات کو سوتے وقت اس نے مادھو سے کہا:-

”مادھو! میں علی الصباح شکار کے لیے جا رہا ہوں تم بھیڑیوں سے بچنا۔“  
صبح کے وقت بدھو کا بستر خالی دیکھ کر مادھو کو بہت خوشی ہوئی۔ اس نے شاننا کو جگا کر کہا: شاننا! ماما دو دو دوسرے لیں تو بکریاں اور بھیڑیوں سے کھیل پر آجانا۔ میں وہیں ہوں گا۔

شاننا نے رازدارانہ انداز میں سر ہلایا اور مادھو خوش خوشی جھیل کی طرف روانہ ہو گیا مگر وہ دھند میں چند قدم سے آگے کچھ دکھائی دیتا تھا۔ جھیل کے کنارے پہنچ کر مادھو نے چاروں طرف دیکھا اور اطمینان کا سانس لے کر گھنے درختوں میں گھس گیا۔ سردیوں میں اس کی منزل مقصود کا راستہ اس قدر دشوار گزار نہ تھا۔ سوکھی ہوئی گھاس اور برجھاتی ہوئی پھنبیوں کی مزاحمت بہت حد تک کمزور ہو چکی تھی۔ مادھو نے چلتے چلتے اپنے پیچھے کچھ گھٹکا محسوس کیا اور بدھو اس ہو کر اوجھڑا دھڑکیٹنے لگا۔ جب اسے کوئی متحرک شے نظر نہ آئی تو وہ اپنے وہم پر منتہا ہوا آگے چل دیا۔

درخت کے نیچے پہنچ کر اس نے سوکھی ہوئی بیل کو ایک طرف ہٹایا اور پتھر کی مورتی کے سامنے بیٹھ گیا۔ نوجوان سنگ تراش کی یہ کوشش کامیاب تھی مورتی مکمل ہو چکی تھی۔ صرف کہیں کہیں کھردری سطح کی صفائی کا کام باقی تھا۔

چھوٹے سے چہرے کے نقوش انسانی خدو خال کا بہترین نمونہ تھے انکھوں میں ایک پراسرار عیدیت کی بجائے رحم، محبت اور عفو کی ایک غیر فانی جھلک تھی۔  
مادھو نے ایک اوزار اٹھایا اور کھردرے حصوں کو کھرج کر صاف کرنے میں مصروف ہو گیا۔

درخت کی پھنبیوں سے شبنم کے قطرے گرنے لگے لیکن مادھو اپنے گرد پیش سے بے خبر اپنے کام میں محو تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مندر سے سیکھا ہوا بھجن گانے لگا۔ اس کے ہلکے سُر تہہ پہنچ بلند ہوتے گئے۔

اچانک مادھو! مادھو! کی آواز سن کر اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ سامنے بدھو کھڑا تھا۔

”چچا!“ اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا ”تم شکار کے لیے نہیں گئے؟“  
بدھو کسی اور دنیا میں تھا اس کے دل و دماغ کی تمام حسیات سمٹ کر انکھوں میں آچکی تھیں اور وہ مورتی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مادھو مرعوب ہو کر پھر بولا: ”چچا! یہ بھگو ان کی مورتی ہے۔ اسے میں نے بنایا ہے۔۔۔۔۔ چچا تم خفا ہو گئے ہو؟“

بدھو پر ان الفاظ کا کوئی اثر نہ ہوا وہ ایک ایسی چٹان کی طرح اپنی جگہ کھڑا تھا جس کے پاس پانی کی بے قرار موجوں کے تھپیڑوں کا جواب ایک ہتھارت امیز خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا مادھو اٹھ کر آگے بڑھا اور بدھو کا بازو پکڑ کر اس کی طرف ملتجیانہ لگا ہوں سے دیکھنے لگا۔

”چچا! میں اسے تم سے چھپانا نہیں چاہتا تھا صرف اسے مکمل کر کے تمہیں دکھانا چاہتا تھا تم نے اسے پسند نہیں کیا؟“

بدھو نے ہاتھ جھٹک کر مادھو کو ایک طرف ہٹا دیا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور مورتی کے قریب پڑا ہوا تیشہ اٹھا کر اسے توڑنے کی کوشش کی لیکن مادھو نے چچا! چچا! کہتے ہوئے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی اور دوسرے ہاتھ سے تیشہ پکڑ لیا۔

چند لمحات کی کش مکش کے بعد مادھو نے بدھو کے ہاتھ سے تیشہ چھین کر

اسے پیچھے دھکیل دیا۔ بدھو کو پہلی بار اپنے بڑھاپے اور مادھو کی جوانی کا احساس ہوا  
 کبھی مادھو اور کبھی مورتی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ محسوس کر رہا تھا کہ دونوں اس کی  
 ہنسی اڑا رہے ہیں وہ جیتے جی اعتراض شکست کرنے والوں میں سے نہ تھا لیکن  
 اس کا ردِ مقابل وہ نوجوان تھا جس کی رگوں میں سکھ دیو کا خون تھا اور یہ خون ایسا  
 نہ تھا جو بدھو کے دل میں سلگتی ہوئی آگ کے لیے پانی کا کام نہ دے سکتا۔ اس کی  
 آنکھوں میں آگ کے انگارے آنسوؤں میں تبدیل ہونے لگے اور اس نے بھرائی  
 ہوئی آواز میں کہا۔ بیٹا! اب تم مجھ سے طاقتور ہو گئے ہو تمہیں سمجھانا اب میرے  
 بس میں نہیں۔ ان الفاظ کے ساتھ بدھو کی آنکھوں سے وہ آنسو جنہیں وہ چھپانے  
 کی نام کوشش کر رہا تھا، بہہ نکلے۔

مادھو کا دل پہلے ہی ندامت سے پساجارہا تھا وہ اس منظر کی تاب نہ لاسکا  
 بے اختیار آگے بڑھا اور بدھو کے قدموں پر گر پڑا۔ چچا! مجھے معاف کر دو مجھے  
 معاف کر دو!

بدھو کو گویا پھر ایک بار کھوئی ہوئی بادشاہت مل گئی۔ اس نے مادھو کو اٹھا  
 کر گلے لگالیا۔ میرے بیٹے! میرے مادھو! میں آج بہت خوش ہوں کہ تمہارے  
 بازو اس قدر مضبوط ہیں تمہیں وہ دن یاد ہیں جب تم اپنے ننھے ہاتھوں سے میرے  
 منہ پر ٹانچے لگایا کرتے تھے اور میں تمہارے ہاتھ چوما کرتا تھا۔ میرے لیے تم آج  
 بھی وہی مادھو ہو۔

بدھو یہ کہہ کر مادھو کے بازو ٹٹولنے لگا۔ مادھو نے پُرم آنکھیں اوپر اٹھائیں  
 بدھو کے لیے اس کے چہرے پر غم کے ہلکے سے آثار بھی بارِ خاطر تھے۔ اس نے اپنے  
 چہرے پر مغموم مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:  
 بیٹا! تم خیال کرتے ہو گے کہ میں تمہارا دشمن ہوں لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے

کہ میں سکھ دیو کے بیٹے کو آگ میں کودتا دیکھوں اور خاموش رہوں۔  
 چچا! میں نے کوئی برا کام نہیں کیا میں نے مورتی بنائی ہے۔ اس بھگوان  
 کی مورتی جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے جس نے زمین اور آسمان بنائے ہیں۔  
 بدھو بولا۔ وہ رام بھی ایسی باتیں کیا کرتا تھا اس نے بھی ایک مورتی بنائی  
 تھی لیکن اسے حکومت کی ہوس تھی۔ وہ مٹی کی مورتی کو پھندا بنا کر آدمیوں کا شکار کھیلنا  
 چاہتا تھا لوگوں کو مورتی کا خوف دلا کر انہیں اپنا غلام بنانا چاہتا تھا۔ وہ دیوتاؤں  
 سے وہی کام لینا چاہتا تھا جو اونچی ذات والے نیچ ذات والوں کے حقوق چھیننے  
 کے لیے کیا کرتے ہیں اس کا پہلا شکار تمہارا باپ تھا لیکن مادھو! میں تمہیں رام نہیں  
 بننے دوں گا۔

مادھو نے پریشان ہو کر جواب دیا۔ لیکن چچا! میں کسی کو غلام نہیں بنانا چاہتا  
 میرا بھگوان اونچی ذات والوں کا بھگوان نہیں جو کسی سے نفرت اور کسی سے محبت  
 کرتا ہے۔ میں بھگوان اسے کہتا ہوں جو سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ جس  
 کے بنائے ہوئے چاند اور سورج کی روشنی ہر گھر میں پہنچتی ہے جس کے نیچے  
 ہوئے بادل ہر کھیت پر برستے ہیں جس کے حکم سے چلنے والی ہواؤں میں ہم سب  
 یکساں طور پر سانس لیتے ہیں جس کی زمین ہر ایک کے لیے اناج اور پھل پیدا کرتی  
 ہے جو ہر ایک سے محبت اور ہر ایک سے انصاف کرتا ہے کیا ہمارا فرض نہیں کہ  
 ایسے بھگوان کی مورتی بنائیں اور اس کی پوجا کریں!۔

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پتھر کا یہ بے جان ٹکڑا جسے کل تک یہ بھی مہم  
 نہ تھا کہ کہاں پڑا ہوا ہے۔ آج تمہارے تیشے کی ضربوں سے کیوں کر اس قابل بن  
 گیا ہے کہ ہم اس کی پوجا کریں تم خود کہہ رہے ہو کہ بھگوان وہ ہے جس نے سورج  
 اور چاند کو بنایا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ جس نے ایسی چیزیں بنائی ہیں وہ خود کیسا

ہو گا۔ کیا اس تراشے ہوئے پتھر کو اس کے ساتھ کوئی نسبت ہو سکتی ہے؟  
 مادھو نے جواب دیا: ”چچا! یہ تو اس کی موتی ہے۔ میں کب کتنا ہوں کہ یہ  
 بھگو ان ہے جب تک اس کی کوئی صورت ہمارے سامنے نہ ہو۔ ہم اس کی پوجا  
 کیسے کر سکتے ہیں؟“

”بیٹا! یہی تو میں کتنا ہوں کہ یہ صورت جو تم نے بنائی ہے بھگو ان کی صورت  
 نہیں ہو سکتی تمہاری اپنی صورت اس سے اچھی ہے۔ اور پھر اگر یہ ضروری ہے  
 کہ پوجا کا شوق پیدا کرنے کے لیے تمہاری آنکھوں کے سامنے کوئی صورت موجود  
 ہو تو کیا یہ مقصد صرف تراشے ہوئے پتھر ہی پورا کر سکتے ہیں۔ کیا چاند اور سورج کو  
 دیکھ کر تمہارے دل میں بھگو ان کی پوجا کا شوق پیدا نہیں ہوتا۔ کیا دنیا کے تمام  
 سنگ تراش مل کر چاند اور سورج جیسی کوئی شے بنا سکتے ہیں؟“

چاند اور سورج تو اس زمین سے دور ہیں۔ تم ہر روز مشرق کے اونچے اونچے  
 پہاڑوں کو دیکھتے ہو جن کی چوٹیوں پر بارہ مہینے برف چمکتی ہے جن کے دامن میں سرد  
 آبشاریں اور ندیاں بہتی ہیں۔ ان پہاڑوں سے پرے اور پہاڑوں جن کی چوٹیاں  
 آسمان سے ملی ہوئی ہیں اگر تم وہاں پہنچ جاؤ تو یہ محسوس کرو گے کہ تراشے ہوئے  
 پتھروں کو بھگو ان کی صورتیں سمجھنے والے اس کا مذاق اڑاتے ہیں اگر تمہارا خیال  
 ہے کہ بھگو ان کسی ایسی طاقت کا نام ہے جس نے دنیا کی ہر شے کو بنایا ہے تو  
 شوق سے اس کی پوجا کرو کوئی تمہیں منع نہیں کر سکتا۔ تمہارا پتا خود ایک زبردست اور  
 انصاف پسند طاقت کو مانتا تھا لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر یہ رنگ رنگ کی چیزیں دیکھ  
 کر تمہارے دل میں بھگو ان کی پوجا کا شوق پیدا نہیں ہوتا تو اپنے ہاتھوں کی تراشی ہوئی  
 موتیاں تمہیں کیا دے سکتی ہیں؟“

(۲)

بدهو کی اس تقریر کے بعد مادھو نے محسوس کیا کہ وہ ایک گہرے خواب سے  
 بیدار ہوا ہے۔ سادہ دل چرواہے کا ہر لفظ اس کے دل پر تیر و نشتر کا کام کر رہا  
 تھا۔ موتی کے تراشے ہوئے نقوش اس کی آنکھوں سے محو ہوئے تھے اور وہ  
 تصویر میں دریا کے کنارے پڑے ہوئے ایک پتھر کو دیکھ رہا تھا جو صدیوں سے  
 بھگو ان کی مقدس موتی کی شکل میں تبدیل ہونے کے لیے کسی سنگ تراش کی نظر گرم  
 کا محتاج تھا۔ مادھو نے اپنے دل سے سوال کیا: کیا تم طاقت کا  
 تصور کر سکتے ہو جو زمین اور آسمان پر حکمران ہے؟ کیا ان تراشے ہوئے پتھروں کو  
 اس عظیم طاقت سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے؟“  
 یہ بات بدهو کے دہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اس کی تقریر کا ہر لفظ مادھو  
 کے تصورات کی خیمیں دنیا کو درہم برہم کر رہا ہے۔ وہ مادھو کی خاموشی کو بٹھکھڑی  
 اور خند سے تعبیر کر رہا ہے۔ اس نے بدول سا ہو کر کہا:

”مادھو بیٹا! میں جانتا ہوں کہ تم پر میری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو گا میں تمہیں  
 منع نہیں کروں گا لیکن تم یہ کام یہاں رہ کر نہیں کر سکتے۔ جہاں بہت جلد یہ ملک  
 چھوڑنا پڑے گا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ اونچی ذات والے نیچے ذات والوں کو ایسے  
 کام کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو تمہاری سزا موت ہوگی۔“  
 مادھو نے جواب دیا: ”چچا! مجھے معلوم نہ تھا کہ تم بھگو ان کے متعلق اتنا کچھ  
 جانتے ہو لیکن میں کسی کو دھوکا دینا نہیں چاہتا تھا بلکہ خود ایک دھوکے میں گرفتار تھا  
 تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ پتھر کی موتی مجھے صرف اس وقت تک بھگو ان  
 نظر آ سکتی تھی جب تک یہ آنکھیں بند تھیں۔ آج آنکھیں کھلنے پر میں محسوس کر رہا ہوں۔“

”کہ وہ ان نگاہوں کی رسائی سے بہت دور ہے۔ ہم صرف اس کی بنائی ہوئی چیزوں سے اس کی عظمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو اس کی صورت میں تبدیل نہیں کر سکتے۔ وہ ہر خوبصورت شے میں موجود ہے۔ بدھو کا دل مسرت سے اچھل رہا تھا اس نے ایک بار پھر آگے بڑھ کر مادھو کو گلے لگاتے ہوئے کہا:

”بیٹا! آج میں نے تمہیں کھوکھلا پایا ہے۔“

”لیکن چچا! سچ بتانا تم بھگوان کو مانتے ہو؟“

بدھو نے جواب دیا: ”میں ایک ایسی طاقت کو مانتا ہوں جس نے آسمان اور زمین کی ہر شے بنائی ہے جس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا جو میں ایک دوسرے سے محبت کا سبق دیتی ہے۔ رہے دیوتا، مورتیاں اور بھگوان، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ ہمارے دشمنوں کی زبان کے الفاظ ہیں جو ان کی آڑ لے کر ہمارا شکار کھیلتے ہیں۔ اگر سچ پوچھو تو مجھے ان سے نفرت ہے۔“

مادھو نے مسکراتے ہوئے کہا: ”چچا! مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنی باتیں جانتے ہو۔“

بدھو بولا: ”سکھ دیو بھی مجھے بے وقوف کہہ کرتا تھا لیکن اس کی زندگی میں مجھے عقلمند بننے کی ضرورت نہ تھی جب میری راہ کا ہر کانٹا وہ دیکھا کرتا تھا مجھے کانٹوں پر چلنے میں لطف آتا تھا اور اتنا بوجھ اٹھا کر میں ہر اٹلی سیدھی راہ پر بے فکر جاسکتا تھا لیکن اب مجھے اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے ہر راستے پر پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ میں بے سمجھ تھا لیکن سکھ دیو کی موت نے مجھے سوچنا سکھا دیا۔ میں نڈر تھا لیکن تمہاری حفاظت کے خیال نے مجھے ڈر پوک بنا دیا۔ کاش! آج سکھ دیو زندہ ہوتا اور اس بے سمجھ بدھو کو بھیڑیں پرانے درختوں پر چڑھ کر

بھڑکی بجائے اور دریاؤں میں کودنے کے سوا کوئی کام نہ ہوتا۔“

بدھو کی آنکھوں میں پھر آنسو چھکنے لگے۔

مادھو نے زمین پر پڑا ہوا تیشہ اٹھایا اور بدھو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”چچا! یہ لو اس مورتی کو اپنے ہاتھ سے توڑ ڈالو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہ کروں گا۔“

بدھو نے تیشہ پر ٹپکایا۔ کچھ سوچنے کے بعد مورتی کی طرف بڑھا اس نے مورتی توڑنے کی نیت سے دو دفعہ تیشہ بلند کیا۔ لیکن مورتی تک پہنچتے پہنچتے اس کا ہاتھ خود بخود رک گیا اس نے مادھو کی طرف دیکھا اور کہا: ”مادھو! تم نے اس کے تراشنے میں کئی دن لگائے ہوں گے؟“

”ہاں چچا! اس نے جواب دیا۔“

”میں اسے نہیں توڑ سکتا۔ چلو اسے کہیں پھینک دیں۔“

”کہاں پھینکیں؟“

”بھیل میں لیکن اس وقت انہیں کوئی دیکھ لے گا۔“

”چچا! میں اسے شام کو پھینک دوں گا۔ چلو! اب گھر چلیں۔“

مادھو نے مورتی کو اٹھا کر سوکھی بیل کے نیچے چھپا دیا اور دونوں گھر کی

طرف چل دیے۔

(۳)

اگلے روز شکر علی الصباح اپنی کوٹھڑی سے باہر نکلا تو مندر کے دروازے کے سامنے ایک خوبصورت مورتی دکھائی دی۔ وہ دوسری کوٹھڑی میں جا کر گویا

کو جگانے کی بجائے بھگوان کی جے! بھگوان کی جے! اس کے نعرے لگاتا ہوا  
سیدھا قلعہ کی طرف بھاگ گھوٹاں درادیر سے اٹھنے کا عادی تھا لیکن شکر کو  
خطرہ تھا کہ آج وہ معمول سے ذرا پہلے اٹھ بیٹھا تو شہر والوں تک یہ عجیب و غریب  
خبر پہنچنے میں خواہ مخواہ کا حصار بن جائے گا اس لیے وہ ہر دس پندرہ قدم  
پر پیچھے دیکھتا اور اپنی رفتار تیز کر دیتا۔ شہر تک پہنچتے پہنچتے اسے سخت سردی کے  
باوجود پسینہ آ رہا تھا۔

شہر سے باہر نکلنے والے چند آدمیوں نے اسے روک کر اس بدحواسی کی وجہ  
پوچھنا چاہی لیکن وہ یہ قیمتی چیز سب سے پہلے شہر کے سردار کے کانوں تک پہنچانا  
چاہتا تھا اس لیے وہ ہر لوہ چھنے والے کو کوئی تسلی بخش جواب دیے بغیر آگے نکل  
گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی آدمی اس کے پیچھے بھاگ گئے ہوئے کہہ رہے تھے: "شکر  
ٹھہرنا شکر کیا ہوا؟"

شہر میں داخل ہوتے ہی اسے سامنے سے رندھیر آتا ہوا دکھائی دیا لوگوں  
کی چیخ پکار اسے شکر کی طرف متوجہ کر چکی تھی اس نے بھی آواز دی۔ شکر ٹھہرو!  
لیکن شکر نے کتر کر دوسری گلی سے نکلنے کی کوشش کی۔ رندھیر کو اس کی اس  
حرکت پر ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی اور اس نے بھاگ کر شکر کو بازو سے پکڑ لیا  
اور جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا:

اے تمہاری یہ حالت! آخر ہوا کیا؟ کہیں چوری تو نہیں کی۔ آدھا شہر تہاڑے  
پیچھے لگا ہوا ہے؟

شکر بری طرح مانپ رہا تھا۔ کچھ دیر اس کے منہ سے کوئی بات نکل  
بالآخر اس نے کہا:

"بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو میں تمہارے پتا جی کے پاس جا رہا ہوں۔"

رندھیر نے جواب دیا۔ جب تک مجھے نہیں بتاؤ گے میں تمہیں نہیں  
چھوڑوں گا۔ اتنے میں بہت سے لوگ شکر کے ارد گرد جمع ہو کر رندھیر کے  
مطالبہ کی تائید کر رہے تھے۔

شکر نے سراپمہر کو چاروں طرف دیکھا اور مایوس ہو کر جواب دیا: میں  
نے مندر میں بھگوان کی نئی مورتی دیکھی ہے جسے دیوتا خود بنا کر رات کے وقت یہاں  
رکھ گئے ہیں۔

رندھیر نے شکر کا بازو چھوڑ دیا لیکن اب دوسروں کی باری تھی۔ رندھیر کے  
ہاتھوں سے آزاد ہو کر اب وہ کئی ہاتھوں کی گرفت میں تھا اور کئی زبانیں اس سے  
مختلف سوالات پوچھ رہی تھیں۔

یہاں شکر! وہ مورتی کیسی ہے۔ پتھر کی ہے یا تانبے کا۔ سونے کی ہوگی  
کتنی بڑی ہے۔ کب دیکھی تم نے؟

شکر نے مختصر سے جوابات سے انہیں ٹالنا چاہا لیکن اسے جلد ہی معلوم  
ہو گیا کہ لوگوں کی تسلی کیے بغیر چٹکارا ممکن نہیں۔ شکر سے اپنے سوالات کا  
جواب پوچھنے والے مندر کا رخ کرنے لگے لیکن ان سے زیادہ تعداد میں اور  
آموجود ہوئے۔ چنانچہ شکر کو اپنا بیان کئی مرتبہ دہرانا پڑا۔ اتنے میں اسے  
گوپال سرپٹ بھاگتا ہوا نظر آیا۔ اس نے لوگوں کی گرفت سے آزاد ہونے کی  
آخری کوشش کی لیکن بے سود۔

گوپال قریب پہنچا تو لوگوں نے اسے بھی ٹھہرانے کی کوشش کی، لیکن وہ  
اپنے مضبوط بازوؤں سے لوگوں کو ادھر ادھر پھٹاتا ہوا آگے گزر گیا۔

شکر ہجوم کی گرفت سے اس وقت آزاد ہوا جب کہ تمام لوگ ایک  
ایک کے مندر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ عورتوں کے بعد عورتوں کی باری تھی

لیکن عورتیں ایسے معاملات کی تفصیل میں نہیں جاتیں۔ اس لیے وہ زیادہ دیر شکر کا راستہ نہ روک سکیں۔

سروا اور پروہت کے مکانات پر جا کر شکر کو معلوم ہوا کہ گوپال ان کے کانوں تک یہ خبر پہنچا چکا ہے اور وہ مندر کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔

شکر دل برداشتہ ہو کر واپس مڑا۔ اب وہ یہ چاہتا تھا کہ مندر کی طرف جانے والے مرد اور عورتیں پھر اس کے گرد جمع ہو جائیں اور اسی بے قراری کے ساتھ اس سے سوالات پوچھیں لیکن اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اب وہ کسی کی معلومات میں اضافہ نہیں کر سکتا۔ کسی نے یہ اعتراف بھی نہ کیا کہ شہر میں سب سے پہلے یہ خبر لانے والا شکر تھا۔ ہر شخص شکر پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ نئی مورتی کے متعلق اس سے زیادہ جانتا ہے۔

تھوڑی دیر آگے چل کر اسے ایک بڑی ٹولی میں رام داس، پروہت اور گوپال نظر آئے وہ تھکی ہوئی ٹانگوں کے احتجاج کے باوجود بھاگ کر اس ٹولی میں شامل ہوا لیکن اسے دیکھتے ہی رام داس نے سوال کیا: "کیوں شکر اقم نے بھی وہ مورتی دیکھی ہے؟"

شکر کے سوال پر گویا کسی نے ٹھنڈے پانی کا مٹکا الٹ دیا۔ اس نے منموم لہجے میں جواب دیا۔ "سرکار! میں نے سورج نکلنے سے بہت دیر پہلے یہ مورتی دیکھی تھی۔ دیوتا اسے مندر کے دروازے کے سامنے رکھ گئے ہیں۔"

شکر کی مظلومیت میں اضافہ کرنے کے لیے گوپال بول اٹھا: "ہاراج! میں نے مورتی مندر کے اندر دیکھی تھی اب شاید باہر آگئی ہو۔"

پروہت نے کہا: "مجھے شکر کا اعتبار نہیں۔ یہ ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے۔"

شکر نے محسوس کیا کہ اس کی ٹانگوں پر جو بوجھ پہلے تھا وہ اب دس گنا زیادہ ہو گیا ہے تاہم وہ حیران تھا کہ مورتی مندر کے اندر کیسے چلی گئی۔

مندر میں داخل ہو کر شکر کو معلوم ہوا کہ گوپال اس کے ساتھ بہت بڑی شرارت کر چکا ہے۔ نئی مورتی جسے اس نے دروازے سے باہر دیکھا تھا اب مندر کے اندر پہنچ چکی تھی۔

لوگوں نے نئی مورتی پر کھلے دل سے دولت پنچاؤر کی۔ پروہت نے سمجھن کا تے لیکن اس کا ردوائی کے دوران میں شکر دل ہی دل میں رندھیر کو کوس رہا تھا اسے یقین ہو چکا تھا کہ دان کی تقسیم میں وہ گوپال کے ساتھ برابر کا حصہ دار نہیں ہوگا۔

مورہنی بھی مندر میں پہنچ چکی تھی اس نے مورتی کے قریب جا کر اسے دیکھا اور پھر لوگوں کی نگاہوں سے بچتی ہوئی رندھیر کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

رندھیر نے مسکراتے ہوئے سوال کیا "مورہنی! میں تمہیں ایک عجیب بات بتانا چاہتا ہوں۔"

"یہاں نہیں۔ میں جھیل کے کنارے درختوں کے نیچے تمہارا انتظار کروں گا اگر مادھو کے متعلق کچھ جانا چاہتی ہو تو ضرور آنا۔ آؤ گی نا!"

مورہنی کے چہرے پر حیا کی سرخی چھا گئی اس نے رندھیر کی نگاہوں سے بچنے کے لیے دوسری طرف منہ پھرتے ہوئے کہا: "آؤ گی۔"

دوپہر کے وقت جب لوگ اپنے اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے مورہنی اپنی ماں اور سہیلیوں سے آنکھ بپا کر جھیل کے کنارے پہنچی۔ رندھیر پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ مورہنی نے اسے دیکھتے ہی کہا: "دیکھو رندھیر! ہارا اس طرح پھرتا"

ٹیک نہیں جلدی کہو کیا بات ہے؟  
 رندھیر نے کہا "میں تمہیں کچھ بتانے سے پہلے اپنی تسلی کر لینا چاہتا تھا۔"  
 "آج کچھ بتاؤ گے بھی۔"

رندھیر نے کہا "مومنی! وہ مورتی شاید مادھو نے بنائی ہے۔"  
 مومنی نے بدحواس ہو کر کہا "مادھو نے؟ میں نہیں مانتی۔ وہ ایسی مورتی  
 نہیں بنا سکتا۔"

"چلو تمہیں کچھ دکھاؤں۔"

"کیا دکھاؤ گے؟"

کوئی ایسی چیز جو میسے دعویٰ کو ثابت کر سکے۔ اوتا گھراتی کیوں ہو؟  
 مومنی تھوڑی دیر پس پیش کے بعد رندھیر کے ساتھ چل پڑی۔  
 جھیل کے دوسرے کنارے پہنچ کر یہ دونوں گھنے درختوں کے جھنڈ میں  
 داخل ہوئے اور رندھیر اس جگہ پہنچ کر رکھا۔ جہاں مادھو تھپڑ تراشا کرتا تھا۔  
 رندھیر نے زمین پر بکھرے ہوئے سنگ ریزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے  
 کہا "مومنی! کیا یہ اسی پتھر کے ٹکڑے نہیں جسے تراش کر وہ مورتی بنائی گئی ہے؟"  
 مومنی نے ایک ٹکڑا اٹھا کر غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا "پتھر کا رنگ  
 تو وہی ہے۔"

رندھیر نے کہا "مادھو کو میں نے یہ مورتی تراشتے ہوئے اس وقت دیکھا تھا  
 جب یہ بالکل نکلتی تھی۔ میں نے تم سے ذکر بھی کیا تھا لیکن مجھے یہ خیال نہ تھا کہ وہ  
 ایسی مورتی تراش سکے گا۔"

لیکن اس مورتی کو مندر میں کس نے پہنچایا؟

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی پہلے اس نے پھول ڈے کر بھگوان کی پوجا

کو بھر مشٹ کیا تھا اور اب اسی نے بھگوان کے مندر پر دھوا بول دیا ہے۔  
 اگر شہر والوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ مورتی جس پر وہ دھن دولت بچھا کر رہے  
 ہیں ایک اچھوت کی بنائی ہوئی ہے تو؟  
 مومنی نے کہا "رندھیر! اگر مورتی اس نے مندر میں رکھی ہے تو بہت بُرا کیا  
 ہے۔!"

رندھیر بولا "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ مورتی اس نے بنائی ہے۔ تاہم  
 میرا یہ خیال ہے کہ اسے مندر میں لے آنے والا کوئی اور ہے۔ ممکن ہے کہ یہ  
 گوپال یا شنکر کا کام ہو۔"

مومنی نے کہا "تو پھر انہیں اس بات کا علم ضرور ہو گا کہ وہ مادھو کی بتائی  
 ہوئی ہے۔"

یہی تو میں سوچ رہا ہوں مومنی! اس کی جان خطرے میں ہے۔

"تم اس سے پوچھ نہیں سکتے؟"

"میں ان سے پوچھنے سے پہلے مادھو سے پوچھنا ضروری سمجھتا ہوں۔"  
 "وہ کہاں ہو گا؟"

"میں پاس ہی اس کا گھر ہے۔ چلو اب وہاں چلیں۔"

"نہیں! مجھے ذمہ جاد کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا؟"

"تم دور ٹھہرنا میں اُس سے پوچھ آؤں گا۔ ممکن ہے کہ وہ راستے میں کہیں بھڑپ  
 چراتا نظر آجائے۔ گنجان درختوں سے باہر نکل کر انہیں ایک طرف سے بغیر کی  
 آواز سنائی دی اور مومنی کا دل دھڑکنے لگا۔"

رندھیر نے کہا "یہ وہی ہے چلو!"

مومنی اور رندھیر ایک ٹیلہ پر سے گزرتے ہوئے ایک کھلے میدان میں پہنچے

مادھو سوکھی گھاس کے ایک ڈھیر پر بیٹھا بفسری بجا رہا تھا۔ اس پاس بکریاں اور بھینس چر رہی تھیں۔ موہنی نے رک کر کہا: "زندھیر اقم پوچھ آؤ۔ میں یہیں ٹھہرتی ہوں۔"

"تم ڈرتی ہو اس سے؟ آؤ!"  
مادھو کے قریب پہنچ کر دونوں کچھ دیر کھڑے رہے۔ وہ اپنی دھن میں لگن تھا بالآخر زندھیر نے آہستہ سے آواز دی: "مادھو!"

مادھو گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا "تم آگئے؟ اس نے کیے بعد دیگرے دونوں کی طرف دیکھا اور بالآخر اس کی نگاہیں موہنی پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔  
موہنی ان نگاہوں کی تاب نہ لاسکی اس نے آنکھیں جھپکالیں۔

زندھیر نے کہا: "مادھو! میں تم سے ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔"  
یاد دھونے چونک کر زندھیر کی طرف دیکھا اور جلدی سے گھاس کا ڈھیر زمین پر بچھاتے ہوئے کہا: "آؤ بیٹھ جاؤ!"

زندھیر نے کہا نہیں میں جلدی ہے میں تم سے صرف ایک سوال کا جواب پوچھنا چاہتا ہوں۔

"وہ مورتی جو تم بنا رہے تھے، کہاں ہے؟"

مادھو نے بدحواس ہو کر پہلے زندھیر اور پھر موہنی کی طرف دیکھا اور دونوں کے چہروں پر غصے کی بجائے ہمدردی کے آثار پا کر کہا: "بیٹھ جاؤ میں بتاتا ہوں۔"  
زندھیر اور موہنی ادھر ادھر دیکھ کر گھاس پر بیٹھ گئے اور مادھو نے ان سے ذرا ایک طرف ہٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا: "تم مندر سے ہو کر آئے ہو؟"

"ہاں!" زندھیر نے جواب دیا۔

"تو پھر مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟"

زندھیر نے کہا: "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ مورتی تم نے وہاں پہنچائی

ہے یا... ۱۰۰۰

"ہاں میں نے۔"

"کیوں؟"

"مورتیوں سے صرف مندروں والے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ میرے کسی کام کی نہ تھیں۔"

"لیکن تم تو بھگوان کا اوتار بننا چاہتے تھے؟"

"میں اب بھی بھگوان کا اوتار بننا چاہتا ہوں لیکن اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے مورتی میری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ بھگوان کی راہ دکھانے کے لیے دنیا میں بہت کچھ ہے۔ چاند، سورج، ستاروں، دریاؤں اور پہاڑوں کے ہوتے ہوئے ہمیں بھگوان کی محبت کے لیے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی مورتیوں کی ضرورت نہیں۔"

زندھیر نے لا جواب سا ہو کر کہا: "اگر لوگوں کو یہ سب باتیں معلوم ہو جائیں تو تم جانتے ہو کہ تمہاری سزا کیا ہوگی؟"

"اگر تم سزا دینا چاہو تو میں حاضر ہوں۔ ورنہ لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں ہو سکتی۔"

شانتا مادھو کا کھانا لے کر آرہی تھی۔ اس کی آمد سے گفتگو کا یہ سلسلہ تھوڑی دیر کے لیے منقطع ہو گیا۔ شانتا نے لسی کا کٹورا زمین پر رکھ کر اس کے اوپر ایک میلے کپڑے میں لپیٹی ہوئی روٹیاں رکھ دیں اور حیرانی اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ زندھیر اور موہنی کی طرف دیکھنے لگی۔ باغ ہستی کا یہ حسین غنچہ اب مکتا ہوا پھول بن چکا تھا۔

زندھیر گزشتہ چند مہینوں میں شانتا کو دوبارہ دیکھنے کی کئی تدبیریں سوچ چکا

تھا آج بھی اس کے تحت الشعور میں اگر حسن اور معصومیت کے اس پیکرِ مجسم کی جستجو کا رنہ رمانہ ہوتی تو وہ مومنی کو مادھو کی تلاش کے لیے اس قدر مجبور نہ کرتا۔ اس کے خوابوں کی دیوی اس کے سامنے تھی وہ کوشش کے باوجود شانتا سے بے تعلقی ظاہر نہ کر سکا۔ اس نے کہا: ”مومنی! تم اسے جانتی ہو؟“

”یہ شانتا ہے، مادھو کی بہن۔ بیٹھ جاؤ شانتا!“

شانتا نے مادھو کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا اور اس کا اشارہ پا کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

مومنی کی نسوانی حس کو رندھیر اور شانتا کی نگاہوں کے سوالیہ جواب سمجھنے میں دیر نہ لگی اس نے کہا: ”جیسے تم نے شانتا کو دیکھا تھا یہ بہت چھوٹی تھی۔“

”ہاں۔ لیکن میں نے اسے اس دن بھی دیکھا تھا۔“

”کب؟“

”جب مادھو کی تلاش کے لیے آیا تھا۔“

رندھیر اور مومنی بچپن کے ساتھی تھے اور انہیں عمر بھر کے ساتھی بنانے کے متعلق دونوں کے والدین کی طرف سے مبہم سے اشارے بھی ہو چکے تھے یہی وجہ تھی کہ مادھو کے جذبات سے باخبر ہونے کے باوجود مومنی اسے اپنے دل میں جگہ دینے کا فیصلہ نہ کر سکی۔ اب تک مادھو کے ساتھ اس کا انس فقط ہم دردی تک محدود تھا۔ وہ رندھیر کے ہوتے ہوئے اپنے دل میں کسی کا خیال تک لانا ایک پاپ سمجھتی تھی۔ وہ یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ اگر رندھیر نہ ہوتا تو وہ مادھو کو اس قدر قریب سے دیکھنے پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی۔ اگر وہ بھی رندھیر کی طرح ایک کھشتری ہوتا تو وہ شاید تمام عمر یہ فیصلہ نہ کر سکتی کہ اپنی دائمی محبت کے لیے کسی کو منتخب کرے اور اگر یہ دونوں اس کے بچپن کے ساتھی ہوتے

تو جوانی تک پہنچتے پہنچتے اس کے دل پر صرف مادھو کا قبضہ رہ جاتا۔ اب وہ رندھیر سے محبت کرتی تھی لیکن مادھو سے دُرتی تھی۔ کیونکہ وہ حسین ہونے کے باوجود ایک اچھوت تھا۔

رندھیر کو انتہائی محبت کے ساتھ شانتا کی طرف متوجہ پا کر اس نے مادھو کی طرف دیکھا وہ بے قرار اور تیز نگاہیں اس کی آنکھوں سے گزرتی ہوئی دل کی گہرائیوں تک جا پہنچیں اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں اس اچھوت کے لیے صرف ہمدردی کے جذبات ہی نہیں، بلکہ وہ اس کے دل کے ساز کے ان سوتے ہوئے تاروں کو چھو سکتا ہے جن تک رندھیر یا کسی اور کی نگاہوں کی رسانی نہیں ہو سکتی۔ وہ سوچنے لگی۔ کاش! مادھو رندھیر ہوتا لیکن اسے فوراً اس خیال پر شرم سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اٹھ کر بولی۔

”چلو رندھیر دیر ہو رہی ہے۔ ماما جی میرا انتظار کرتی ہوں گی۔“

رندھیر بادلِ سخنواستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مادھو اور شانتا بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

رندھیر نے کہا: ”مادھو! مومنی کو تمہاری بہت فکر تھی۔“

مومنی کو رندھیر کی یہ طعنہ زری معلوم ہوئی۔ وہ اس کے جواب میں شانتا کو رندھیر کے متعلق کچھ بتانا چاہتی تھی۔ تاہم وہ خاموش رہی۔

رندھیر نے پھر کہا: ”اچھا مادھو چلتے ہیں ہم نے تمہیں بہت پریشان کیا۔“

”کاش! تم مجھے ہر روز پریشان کرتے رہو۔“ یہ کہہ کر مادھو مومنی کی طرف دیکھنے لگا۔

”بھئی! میں بھی گھر جاتی ہوں۔ شانتا نے کہا۔“

”اچھا جاؤ۔“

شانتا، مومنی اور زندهیر کے پیچھے پیچھے چل دی۔ زندهیر نے مرکز پر چھاٹا  
تھاڑا بجائی اب بھی پتھر تراش کر تباہی نہیں ہے۔  
”اے خجہ بدھونے منع کر دیا ہے۔ وہ مورتی جو اس نے بنائی تھی وہ بھی  
کبیں پھینک آیا ہے۔“

مومنی نے پوچھا۔ تمہاری ماں کیسی ہے؟  
”اچھی ہے تم اس سے ملو گی، چلو وہ بہت خوش ہو گی۔“  
زندهیر نے کہا۔ ”ماں مومنی دیکھو گی اس کی ماں کو؟“  
”نہیں! اب میں دیر ہو رہی ہے۔ پھر سہی۔“  
تھوڑی دیر چل کر ان کے راستے علیحدہ ہو گئے۔

زندهیر نے شانتا (۲۹۰) کو دیکھا۔

مومنی اور زندهیر کو رخصت کرنے کے بعد مادھو کچھ دیر بے حس و حرکت اپنی جگہ  
پر کھڑا رہا لیکن وہ جونہی ٹیلے کی آڑ میں غائب ہوئے اس کے دل میں اک طوفانی سا  
اٹھا اور وہ کچھ سوچے بغیر ان کے پیچھے بھاگا اور ان کی آن میں ٹیلے کی چوٹی پر جا  
پہنچا۔ زندهیر اور مومنی اتنی دیر میں ٹیلے سے نیچے اتر کر جھیل کے کنارے رستوں  
کے قریب پہنچ چکے تھے۔ مادھو کی بے قرار نگاہیں کچھ دیر ان کا تعاقب کرتی رہیں  
لیکن تھوڑی دیر میں وہ گھنے درختوں میں چھپ گئے اور مادھو کو فضا میں ہر طرف  
اواسی نظر آنے لگی۔ اس نے سوچا۔ شاید میں مومنی کو دوبارہ نہ دیکھ سکوں۔ وہ آنے  
والی زندگی میں مایوسی، تنہائی اور بے بسی کے تصور سے کانپ اٹھا۔ مندر اور مورتیاں  
چھوٹ اور اچھوت کی حد فاصل کی درمیان اب تک ایک پل کا کام دے رہی

تھے لیکن اب یہ پل منہدم ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں مومنی نے جھگوان کی مورتی کے  
لیے جگہ خالی کی تھی لیکن بدھو کی بے وقت مداخلت نے ایک اچھوت کے دل  
کو زیادہ غمزدہ جھگوان کی مورتی کا مندر نہ بننے دیا۔

تمام مورتی سے رشتہ توڑنے کے بعد مادھو کو احساس ہوا کہ اس کے دل  
کی بہت سی ایک ایسے وجود کے تصور سے آباد ہو چکی ہے جو دنیا کے حسین مناظر کی  
طرح ایک زندہ حقیقت ہے۔ یہ زندہ حقیقت مومنی تھی۔ مومنی جس کے  
اس کے شعور میں داخل ہو کر اس کے دل میں مندر، مورتیاں اور دیوتاؤں سے لگاؤ  
پیدا کیا تھا۔ مومنی جو اس کا منہاٹا ہوا تصویر تھی۔ جس تک پہنچنے کے  
لیے وہ جھگوان کی مورتی کی رہنمائی اور مدد چاہتا تھا۔ جھگوان یا کائنات کی ایک  
عظیم طاقت کا اے اب بھی اعتراف تھا لیکن اس کی پرواز کا رخ جھگوان کی طرف  
نہ تھا بلکہ وہ اس زبردست طاقت سے قوت پرور حاصل کر کے اس خلیج کو عبور  
کرنا چاہتا تھا جو مومنی اور اس کے درمیان خائل تھی۔

ٹیلے پر کھڑا کچھ دیر وہ آگے بڑھنے یا پیچھے کوٹھنے کا فیصلہ نہ کر سکا لیکن  
اچانک ایک خیال ہے اس کے جسم میں بجلی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ کیا مومنی کو یہاں  
لانے میں اس زبردست قوت کا ہاتھ نہیں۔ کیا اس کا یہاں آنا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ  
اسے میرے ساتھ انس ہے؟ لیکن میں انتہائی کوشش کے باوجود اسے دل کی بات  
نہ بنا سکا۔ اسے خوش کرنے کی بجائے میں نے اونچی ذات والوں کو برا بھلا کہہ کر  
شاید اسے ناراض کر دیا ہو۔ کیا یہ ضروری نہ تھا کہ میں اپنا دل کھول کر اس کے سامنے  
رکھ دیتا؟

یہ خیال آتے ہی اس نے محسوس کیا کہ وہ زبردست قوت ایک تازہ اقدام  
کے لیے اس کی تائید کر رہی ہے۔ وہ جھاریوں سے بچتا اور پتھروں پر کودتا ہوا

پیلے سے نیچے اترا اور پوری رفتار سے بھاگنے لگا۔  
درختوں سے نکل کر زندھیر اور موہنی کو دیکھتے ہی اس کی رفتار سست پڑ  
گئی۔ اس نے اپنے دل سے سوال کیا: اگر زندھیر برآمان گیا تو؟ اور پھر خود ہی  
پر کمر دل کو تسلی دینے لگا۔ نہیں زندھیر ایسا نہیں۔ وہ اونچی ذات کے دوسرے  
انسانوں سے مختلف ہے اسے میرے ساتھ ہمدردی ہے۔ اور اگر وہ خفا  
بھی ہو جائے تو بھی مجھے اس کی پروا نہیں۔ محبت پاپ نہیں۔ موہنی یقیناً میری  
باتوں سے خفا نہ ہوگی۔ اور اگر خفا ہو بھی گئی تو کم از کم میرے دل سے تمام عمر کی  
خلش دور ہو جائے گی۔ اس کی رفتار پھر تیز ہونے لگی۔

زندھیر اور موہنی اس کے پاؤں کی آہٹ سے پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے۔ ان کی  
جواب طلب نگاہیں پھر اس کے پاؤں کی زنجیریں گئیں اور وہ رک کر ایک لمحے کے  
توقف کے بعد آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔  
زندھیر نے پوچھا: کیوں مادھو! خیر تو ہے؟ زندھیر کے لیے میں ہمدردی  
بھی تھی اور حیرانی بھی۔ تاہم مادھو کچھ دیر اس کے سوال کا جواب دے سکا۔  
بالآخر اس نے بڑی کوشش کے بعد کہا: میں... میں۔ موہنی دیوی سے  
کچھ کہنا چاہتا تھا۔

موہنی پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ زندھیر نے کہا: کہو! کیا کہنا  
چاہتے ہو موہنی سے؟

مادھو کے دماغ میں اب کوئی موضوع تھا نہ الفاظ۔ اس نے بڑی مشکل  
سے کہا: موہنی دیوی! ابھی جو کچھ میں نے مورتی کے متعلق کہا تھا۔ آپ اس سے  
خفا تو نہیں ہو گئیں؟

موہنی اس سوال کا جواب دینے کی بجائے مراسیمگی کے عالم میں اس کی

طرف دیکھنے لگی۔ مادھو پھر بولا: میرا یہ ارادہ نہ تھا کہ میں آپ کا دل دکھاؤں۔  
موہنی نے مادھو کو ٹانگنے کی نیت سے کہا: میں تم سے خفا نہیں۔ مجھے  
تم پر خفا یا خوش ہونے کا حق ہی نہیں۔  
مادھو کہنا چاہتا تھا کہ یہ حق میں آپ کو ملے چکا ہو لیکن اسے جرأت نہ  
ہوئی۔ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اسے موہنی کی بجائے زندھیر سے طلب  
ہونا نسبتاً آسان نظر آیا۔ وہ بولا:

”زندھیر! میں دیوتاؤں سے محبت نہ کر سکا۔ لیکن میرے دل میں تمہارا پریم  
اس پریم سے کہیں زیادہ ہے جو تمہارے دل میں دیوتاؤں کے لیے ہے۔ میں  
اس زبردست طاقت کو ماننا ہوں جسے تم جگوان کہتے ہو لیکن میں اپنے ہاتھوں  
کی بنائی ہوئی مورتیوں کی بجائے جگوان کے بنائے ہوئے دیوتاؤں سے پریم  
کرنا بہتر سمجھتا ہوں اور میرے لیے تم جگوان کے بنائے ہوئے دیوتا ہوں۔  
اس تم کا اشارہ زندھیر سے زیادہ موہنی کی طرف تھا اور وہ اس کی  
مٹھائیں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ ایک عورت تھی اور  
اس کے سامنے وہ ایک مرد تھا جس کی آنکھوں میں شب کی سیاہی اور تانوں کا  
نور تھا۔ جس کی ہر نگاہ چھوت اور اچھوت کے درمیان کشیدوں سے تعمیر ہونے  
والی ناقابل تسخیر دیواروں کو مسمار کر رہی تھی۔

اس نے اضطرابی حالت میں کہا: مادھو تم تم سے ناراض نہیں۔ انسان کی  
مقدس بیٹی کا غور و ملائمت میں تبدیل ہو چکا تھا لیکن ان الفاظ کے بعد جب اس  
نے زندھیر کی طرف دیکھا تو یہ ملائمت حیا میں تبدیل ہونے لگی۔ اس نے کہا:

”چلو زندھیر! مادھو نے پوچھا: پھر آؤ گے؟“

زندہ حیرنے جواب دیا: شاید!

اس شاید سے زندہ حیر کا مطلب ضرور تھا لیکن موتی اپنے خیال کے مطابق  
میشہ کے لیے جدا ہو رہی تھی۔

(۵)

اس ملاقات کے بعد مادہ حوک زندگی کی تمام دلچسپیاں سمٹ کر موتی کے تصور  
میں سما گئیں۔ اسے دنیا کی ہر حسین شے اور ہر دلکش منظر میں موتی کی جھلک نظر  
آنے لگی۔ موتی جس نے اس کے تحت الشعور میں داخل ہو کر اسے بھگو ان کی طرف  
مائل کیا تھا جس نے اپنے خالق کی مورتیاں بنانے پر آمادہ کیا تھا۔ اب اس کے  
دل و دماغ کی تمام صلاحیتوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

بھگو ان کی مورتی کو مندر میں چھوڑ آئے کے بعد مادہ حوک نے محسوس کیا کہ وہ  
زنجیر جس کی مدد سے وہ موتی کے ساتھ منسلک ہونا چاہتا تھا، ٹوٹ چکی ہے۔  
وہ پل جو اچھوت کے لیے ایک جھوپڑے کو چھوت کے محل ہے ملانے کا کام دے  
سکتا تھا ایک غیر متوقع سیلاب کی نذر ہو چکا ہے۔

کئی مہینے مورتی تراشتے میں منہمک رہ کر وہ کئی ہوائی تلخے تعمیر کر چکا تھا مورتی  
کے سامنے ہاتھ باندھ کر ہر التما کے بعد اسے محسوس ہوتا کہ آج نہیں تو کل کل  
نہیں تو پرسوں بھگو ان کا اوتار بن جائے گا۔ بھگو ان اپنی بے جان مورتی کو بلانے  
کی قوت عطا کرے گا۔ اور وہ کہے گی کہ مادہ حوک تم سے بہت خوش ہیں یاگو  
کیا مانگتے ہو؟ اور وہ جوش عبودیت میں مورتی کے پاؤں پر سر رکھ کر اس کے مقدس  
چرنوں کو اپنے آنسوؤں سے دھونے کے بعد کہے گا کہ بھگو ان! میں تجھ سے

موتی کو مانگتا ہوں۔ اور بھگو ان یہ کہے گا کہ تم میری درخواستیں پوری کرتے  
ہیں۔

پھر بھگو ان اپنی نامعلوم قوتوں کے ساتھ ادنیٰ ذات والے ہر شخص کے  
دل میں داخل ہو کر کہے گا: دیکھو! مادہ حوک ہمارا اوتار ہے تمہیں اس سے نفرت  
کرنے کا حق نہیں۔ اور اس کے زبردست ہاتھ موتی کو سماج کی زنجیروں سے چھڑا  
کر اس کے پاس لے آئیں گے اور پھر وہ ادہ موتی مل کر ایسی دنیا تعمیر کریں گے  
جس میں ہر انسان۔ انسان سمجھا جائے گا جس میں چھوت اور اچھوت کے ریا  
نفرت اور حقارت کی دیواریں نہیں ہوں گی۔

لیکن بدھونے پر تمام ہوائی تلخے مسمار کر دیے حسین سپنوں کی سہانی رات  
دن کی تلخ حقیقتوں میں تبدیل ہو گئی۔ اور وہ بار بار اپنے دل میں یہ کہہ رہا تھا کہ  
کاش! میں تمام عمران سپنوں کے فریب میں مبتلا رہتا۔

صبح کے وقت اس نے بدھوک کے ساتھ بھیڑیں بے جاتے ہوئے ٹیلے  
پر چڑھ کر شہر کی طرف دیکھا وہ گپ ڈنڈیاں جو باہر کی دنیا کو شہر سے ملائی تھیں اسے  
ناقابلِ نگہ دار دراصلہ شکن نظر آنے لگیں اس نے مندر کی طرف نگاہ دوڑائی اور محسوس  
کیا کہ وہ مورتی جسے وہ خود تراش کر مندر میں رکھ آیا تھا۔ موتی اور اس کی قوم کے  
تمام انسانوں کو مادہ حوک اور اس کی قوم کے تمام انسانوں کے ساتھ نفرت اور  
عداوت کا سبق دے رہی ہے۔ اور یہ کہ وہ بھگو ان کا اوتار بننے کے لیے نہیں  
بلکہ اچھوت بننے اور اچھوت کھلانے کے لیے پیدا ہوا ہے۔

لیکن دوپہر کے وقت زندہ حیر کے ساتھ موتی کی غیر متوقع آمد کے بعد اس  
پر حقیقت کھلی کہ وہ سماج کے مندروں اور مورتیوں کا باغی ہونے کے باوجود دنیا  
کی نظروں میں قابلِ نفرت نہیں اس انکشاف کے بعد زندگی کی تلخ حقیقتیں پھر

حسین سپینوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ نہوائی قلعے پھر تعمیر ہونے لگے۔ اس کے  
من مندر میں بھگوان کی مورتی کی خالی جگہ موسیٰ کی جلیبی بنا گئی تصویر بننے کے لیے  
مورتی کے وسیلہ سے بھگوان تک پہنچنے کی بجائے اسے موسیٰ کا وسیلہ بنا کر بھگوان  
تک پہنچنا زیادہ آسان اور خوش کن نظر آنے لگا۔  
ماوصو کو اپنی دنیا کے ہر افق پر موسیٰ اور صرف موسیٰ نظر آنے لگی۔ ہر  
کے ہر نفع میں اس کی آواز کی مٹھان پیدا کرنا چاہتا تھا اور اسے زمین کے ہر  
پتھر کو تراش کر موسیٰ کی شکل میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سماج والوں  
کے ہر انداز سے بھگوان کی خیالی تصویریں اٹھا کر ان کی جگہ موسیٰ کی تصویریں رکھ  
دے۔ مندر کی مورتیاں بھگوان کے متعلق سنگ تراشوں کے اپنی تصورات کی مانند  
تھیں لیکن موسیٰ بھگوان کی اپنی قوت تخلیق کا منظر تھی اس کی صفائی کا بہترین نمونہ۔

۱۔ موسیٰ کے لیے بڑھتے ہوئے مشقوں کے ساتھ ہی گرو متپیش کی دل چسپائی کم  
کے ہوئے لگیں۔ چند دنوں کے بعد اس نے محسوس کیا کہ بھیر میں چلنے اور پھیلیاں  
پکڑنے کا مشغلہ ایسا نہیں جو اس کے دل کی بڑھتی ہوئی بے قراری کا دوا ہو سکے  
اسے انتظار کے لیے لمبے دن اور تنہائی کی طویل راتیں صبر آنا نظر آنے لگیں۔  
اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اسے کسی ہر از کسی رفیق اور کسی دوست کی ضرورت  
محسوس ہوئی لیکن اس پاس کی بستیوں کے اچھوتوں میں کوئی ایسا نہ تھا۔  
اس کی اس ضرورت کو پورا کر سکتا۔ احساس کمتری میں پے ہوئے انسانوں میں  
کوئی ایسا نہ تھا جو اس کی بڑھتی ہوئی آمگلوں اور اٹھتے ہوئے حوصلوں کی تائید  
کرنا۔

قریباً دو ہفتے انتہائی پریشانی کی حالت میں گزارنے کے بعد وہ جھیل کے  
کنارے ایک جگہ زمین میں دفن کیے ہوئے انداز نکال کر گھر لے آیا۔ دوپہر

کے وقت اس نے دریا کے کنارے پرانے ہوئے پتھروں میں سے ایک سفید  
رنگ کا بھاری پتھر منتخب کیا اور اسے بھی اٹھا کر گھر لے آیا۔

لوگوں کی نگاہوں سے بچ کر ایسا مشغلہ جاری رکھنے کے لیے جھیل کے  
اس پاس کی محفوظ مقامات آئے لیکن ماوصو اس معاملہ میں کسی کی مداخلت  
کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ سماج والوں کی طرف سے اسے اطمینان تھا کہ ان  
کی نگاہوں سے اور جھیلوں کی نسبت اس کی جھوٹری زیادہ محفوظ ہے۔ اپنے

گھر میں اسے سب سے زیادہ بدھو کی مخالفت کا ڈر تھا لیکن اسے یہ تسلی تھی کہ  
بدھو فقط دیوتاؤں کی مورتیوں سے نفرت ہے۔ جب اسے یہ علم ہو گا کہ وہ  
بھگوان یا دیوتا کی بجائے کسی انسان کی مورتی بنا رہا ہے تو شاید وہ معترف ہو  
چناںچہ جب بدھو شام کے وقت جھیل کے کنارے واپس آیا تو ماوصو  
سنگ تراشی میں مصروف تھا۔ اس نے آتے ہی کنولی اور شاننا سے جواب  
کھڑی تھیں۔ پوچھا: "ماوصو کہاں ہے؟"

کنولی سے سادگی سے جواب دیا: "اندر پتھر توڑ رہا ہے۔ کتنا ہے شانا  
کے لیے پتھر کی گڑیا بنا دی گئی۔ اور اسے دیکھو یہ اتنی بڑی ہو کر گڑیا سے  
کھیلے گی؟"

شاننا اپنی ماں کے اس جواب پر بدھو کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر

گھبرا گئی اور جلدی سے بولی: "ہاں چچا! بھیتا بہت اچھی گڑیا بنا رہا ہے۔"  
جھوٹری کے اندر تیشے کی ٹھکا ٹھکا اچانک بند ہو گئی اور ماوصو جھکا  
ہوا باہر نکلا اور بدھو کی طرف سے کسی سوال کا انتظار کیے بغیر لڑا۔ چچا میں شانا  
کے لیے گڑیا تراش رہا ہوں۔

بدھو کچھ کے بغیر جھوٹری کے اندر داخل ہوا اور پتھر کی صفات سے

توڑے پریشان ہو کر مادیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں طرح طرح کے شکوک کا اظہار کر رہی تھیں۔

مادیوں پھر بولا "چچا! شانتی کہتی تھی کہ مجھے گڑبانا دے اور میں بھی بہت اس تھا چند دن جی لگا رہے گا۔"

شاننا اب جوان ہے اسے گڑبایا کیا کام مادیوں نے دیا ہے کہ وہ اپنے خیالات ابھی تک درست نہیں ہوئے۔

چچا تو ہمارا خیال ہے کہ میں پھر بھگوان کی مورتی بن کر باہر ہوں، نہیں نہیں میں جھوٹ نہیں بنوں۔ میں ایک ایسی گڑباناؤں کا جسے آپ بھی پسند کریں گے۔

مادیوں کا جواب بدھ کو مطمئن نہ کر سکا۔ تاہم وہ خوش تھا کہ مادیوں نے یہ بات اس سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

چند دنوں کے بعد سنگ تراشی میں مادیوں کا برہمچاریا ہوا انہماک دیکھ کر بدھ اور کنول پریشان ہونے لگے۔ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک جھونپڑی سے ٹھکا ٹھک کی آواز آتی رہتی اور جب تیشہ چلاتے چلاتے مادیوں کے ہاتھ تھک جاتے تو وہ تھوڑی دیر کے لیے ہنسری اٹھا لیتا اور جھونپڑی میں کبھی پرستار اور کبھی درونماک نغمے گونجنے لگتے۔ شاننا بھی اپنی گڑبایا کے لیے مادیوں کی اس

درجہ محنت پر حیران تھی۔

کبھی کبھی بدھ کو اسے بھیریس چرانے یا شکار کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا لیکن مادیوں کے کام کی تکمیل کا شوق اسے زیادہ دیر باہر نہ بٹھرنے دیتا۔ چند دنوں کے بعد شاننا اپنے گھر میں ایک خوبصورت گڑبایا دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سمائی تھی لیکن مادیوں کاوش پر مطمئن نہ تھا۔ شانتی اس کے کان میں کہا: "بھیا! یہ تو مورتی معلوم ہوتی ہے اس نے جواب دیا: "نہیں نہیں! یہ مورتی جیسی نہیں اور بناؤں گا اس سے بھی زیادہ خوبصورت۔"

مادیوں نے اس کاوش کو دیکھ کر حیران رہا۔ اس کے مادیوں ایک ناسمجھ تراش رہا تھا۔

شاننا کے ساتھ ابتدائی دو تین ملاقاتیں مادیوں کی موجودگی میں ہوئیں۔ اس

## زندہ پیر اور شانتی

زندہ پیر کے مورتی کے متعلق اپنے خیالات کا کبھی تجزیہ نہیں کیا تھا وہ کچھ نہیں

ایک ساتھ ہے۔ ایک ہی پنڈت سے تعلیم پائی۔ ایک دوسرے کے متعلق نہیں

تنہائی میں سوچنے کا موقع ہی نہ ملا اور جوانی کی ابتدائی منزل میں قدم رکھنے کے بعد

بھی ان دونوں کو مستقبل میں جدائی کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس لیے وہ جذبات جوڑائی کے خدشات میں ابھرتے ہیں۔ ایک دائمی قربت کی وجہ سے بے بس مورتی مادیوں کے بعد زندہ پیر کو اپنا نگہبان اور محافظ خیال کرتی تھی اور وہ اسے اپنی زندگی کی ایک

بہت بڑی دل چسپی سمجھتا تھا۔

شاننا اور مادیوں سے آخری ملاقات کے بعد دونوں کو اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے کا موقع ملا۔ زندہ پیر ایک ناپختہ ذہن جوان کی طرح زندگی کے چند دن حالانکہ سبیلان کے ساتھ بیٹھا جانتا تھا لیکن مورتی ایک عورت کی فطرت سے مجبور ہو کر آنے والے طوفان سے بچنے کے لیے کسی جائے پناہ کی تلاش میں تھی۔

زندہ پیر جب بھی صبح کے وقت شکار اور شام کے وقت سیر کے بہانے سے نکلتا اس کی پہلی اور بعض اوقات آخری منزل جھیل کے آس پاس کی چراگاہیں ہوتیں

کبھی مادیوں سے ملنے کے بہانے شاننا سے ملاقات ہو جاتی اور کبھی اسے مادیوں کو ملنا پڑتا۔

شاننا کے ساتھ ابتدائی دو تین ملاقاتیں مادیوں کی موجودگی میں ہوئیں۔ اس

یہ اس سے کچھ کہنے اور سننے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ایک دن چراگاہ میں مادھو کے ساتھ بدھو سے بھی ملاقات ہوئی۔ بدھو اونچی ذات والوں کے متعلق اپنی رائے بدلنے کے لیے تیار نہ تھا لیکن زندھیر کے ساتھ وہ بہت جلد مانوس ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ زندھیر اس کے ساتھ نہایت انکسار سے پیش آیا۔ وہ سری وجہ یہ تھی کہ زندھیر کا لباس قریباً وہی تھا جس میں اس نے پہلی بار سکھ لیکو دیکھا تھا۔ سکھ لیکو کی طرح اس کی کمر میں بھی تلوار لٹک رہی تھی۔ اس کی انگلی میں سونے کی ایک انگوٹھی بھی تھی۔ سکھ لیکو کی انگوٹھی کنول کے پاس تھی اور تلوار اب تک بدھو نے نہ ہتھیاری تھی۔

بدھو نے پوچھا: تم راجہ کے سینا پتی ہو؟  
نہیں، زندھیر بدھو کے منہ سے سینا پتی کا لفظ سن کر حیران ہوا۔ اس نے جواب دیا: نہیں! میں سینا پتی نہیں۔ میں انانک سینا پتی تھا لیکن اب وہ شہر کا دروازہ ہے۔ اب بدھو نے کہا: تمہارے پتا جی تو تم لوگوں کے منہ زور لغت کرتے ہو گے؟  
نہیں وہ ہر ایک سے انصاف کرتے ہیں۔

میں نے سنا ہے تمہارا ایک سینا پتی اچھوتوں کا بہت بڑا دشمن تھا شاید گنگا رام تھا نام اس کا؟

گنگا رام کو مرے ہوئے بہت مدت ہوئی ہیں اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔  
گنگا رام کو کسی اچھوت نے مارا تھا؟

نہیں اسے ایک کشتری نے مارا تھا وہ میرے پتا کا دوست تھا۔  
کیا نام تھا اس کا؟

سکھ لیکو۔  
سکھ لیکو کا نام سن کر مادھو چونکا ہوا لیکن وہ یہ سمجھ کر خاموش ہو رہا کہ ایسی

نام کا کوئی دوسرا شخص ہوگا۔

بدھو نے مادھو کی موجودگی میں یہ سلسلہ کلام جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے کہا: مادھو مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ جاؤ گھر سے لسی لے آؤ۔  
مادھو گھر کی طرف چل دیا اور بدھو نے زندھیر سے پوچھا: تمہارے باپ کا نام رام داس تو نہیں؟

ہاں! ان کا نام یہی ہے، لیکن تم کیسے جانتے ہو؟  
میں نے کسی سے سنا ہے۔

بدھو سکھ لیکو سے اس کی سرگزشت کئی بار سن چکا تھا۔ اب یہ معلوم کر کے کہ زندھیر رام داس کا بیٹا ہے اس کے لیے سب سے شکوک جاتے لیے ورنہ اونچی ذات کے کسی شخص کے ساتھ مادھو کا میل جول اس کے لیے یقیناً تکلیف دہ ہوتا۔ اس کے جی میں آئی کہ اسے سکھ لیکو کے متعلق کچھ بتائے، لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہا۔ زندھیر کی آنکھیں جھونپڑی کی طرف لگی ہوئی تھیں لیکن اس کی توقع کے خلاف جب مادھو لسی لے کر اکیلا واپس مڑا تو وہ دل پر ایک بوجھ سا لے کر رخصت ہوا۔ راستے میں جھیل کے قریب پہنچ کر اس کا دل مسرت سے اُچھلنے لگا۔ شاننا پانی کا گھڑا سر پر اٹھائے آ رہی تھی وہ زندھیر کو دیکھ کر ایک وزحمت کے نیچے کھڑی ہو گئی۔  
شاننا! اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

شاننا نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور اس کے مرمریں چہرے پر حیا کی سرخی چھا گئی۔

شاننا! میں تمہارے بھائی کے پاس بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا تھا۔  
شاننا نے جھجکتے ہوئے گھڑا نیچے رکھ دیا اور پوچھا: موہنی دیوی کیسی ہے؟  
"اچھی ہے، تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔"

”وہ آپ کی کیا ہوتی ہے؟“

”وہ میرے پتا کے دوست کی بیٹی ہے۔“

دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ رندھیر اس سکوت کو توڑنے کے لیے کچھ کہنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ ایک طرف سے کسی چوپائے کے بھاگنے کی آہٹ اور کسی انسان کی گالیاں سنائی دیں۔ درختوں میں سے ایک بڑا اس گائے نمودار ہوئی اس کے پیچھے شکر گالیاں بکتا ایک ہاتھ سے گائے کی دم پکڑنے اور دوسرے ہاتھ سے ڈنڈے برسنا آچلا آ رہا تھا لیکن گائے تھی کہ مڑنے کا نام نہ لیتی تھی اور ہانپتے ہوئے شکر کا پارہ اس لیے بھی تیز ہو رہا تھا کہ یہ گائے گوپال کی تھی۔ رندھیر نے جلدی سے کہا: اچھا شانتا! تم جاؤ پھر میں گے۔

شانتا گھڑا اٹھانے لگی اور رندھیر ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ شکر نے ان دونوں کو دیکھ کر گائے کی دم چھوڑ دی اور رندھیر کے قریب آ کر کہا۔ بڑی خراب ہے بھی یہ گائے!

رندھیر نے جواب دیا: ”گائے خراب نہیں ہے تو وہ بے وقوف ہے!“

شکر رندھیر کی طنز کو پی گیا اور بولا: ”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

رندھیر نے جواب دیا: ”میں شکار کے لیے آیا تھا۔ اب تمہارا منہ دیکھ لے۔ اس لیے گھر جاتا ہوں۔“

شکر نے کہا: ”شکار تو جا رہا ہے۔“

”کون سا شکار؟“

شانتا کچھ دور جا چکی تھی۔ شکر نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

”وہ! —“

رندھیر نے کوٹ کر کہا: ”دیکھو شکر! ہوش سے بات کرو۔ تم ایک پرہیزگار“

شکر نے کھسیانا ہو کر کہا: ”معاف کرنا میں مذاق کر رہا تھا۔“

”مذاق کرنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے اور وہ بھگوان نے بد قسمتی سے

تمہیں نہیں دی۔“

شکر بڑبڑاتا ہوا گائے کے پیچھے اور رندھیر اسے دل ہی دل میں کوستا ہوا شہر کی طرف چل دیا۔

(۲)

اساڑھ کے آخری دن تھے۔ مغرب کی طرف نصف آسمان پر سیاہ، سفید اور میٹھے رنگ کے بادل چھا رہے تھے۔ ہوا ساکن تھی اور فضا میں جیس تھا۔ دھیر کے وقت سورج بادلوں کے لحاف میں چھپ گیا اور ابر کا سایہ تیز رفتاری سے مشرق کے ٹیلوں اور پہاڑوں پر دوڑنے لگا۔

شانتا اور کنول اپنی جھونپڑی کے سامنے ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اچانک شانتا کو جھونپڑی کے پیچھے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی اس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا اور وہ اٹھ کر جھونپڑی کی دوسری طرف پہنچی۔ چند قدم پر رندھیر گھوڑے کی لگام تھامے تخت سناں لگا جڑوں سے اوجھڑا دھڑک رہا تھا۔ شانتا کی نگاہوں نے اسے سمجھا دیا کہ یہاں باقیں کرنا مناسب نہیں اور رندھیر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتا دیا کہ وہ جھیل کی طرف جا رہا ہے۔ رندھیر کا گھوڑا گھنے درختوں میں غائب ہو گیا اور شانتا اپنی ماں کے پاس آ بیٹھی۔

کنول نے پوچھا: ”کون تھا شانتا؟“

اس نے جواب دیا: ”خبر نہیں کون تھا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بولی“

”ماتا! آج بہت گرمی ہے میں ذرا جھیل پر نہا آؤں۔“

”ابھی تو وہاں سے آتی ہو، اچھا جاؤ۔“

شانتا اپنی ماں کی حد نظر تک تو معمولی رفتار سے چلتی رہی لیکن جھاڑیوں کے عقب میں پہنچتے ہی وہ ایک وحشی ہرنی کی طرح بھاگنے لگی۔  
رندھیر کا گھوڑا ایک درخت سے بندھا ہوا تھا اور وہ پانی میں غوطہ کھا کے بعد کپڑے بدل رہا تھا۔ رندھیر کو دیکھتے ہی شانتا کی رفتار سست پڑ گئی اور وہ اس کے قریب جانے کی بجائے کنا سے سے کچھ فاصلے پر ایک منخت کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ رندھیر نے اس کے قریب پہنچ کر کہا ”شانتا! تم آگئیں؟“  
شانتا نے رندھیر کو جواب دینے کی بجائے ایک ہاتھ سے درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ پکڑ کر نیچے کھینچی اور دوسرے ہاتھ سے ایک پتہ توڑ کر نیچے پھینک دیا۔

رندھیر نے پھر سوال کیا ”شانتا! ابادھو کہاں ہے؟“

شانتا نے دوسرا پتہ توڑتے ہوئے جواب دیا ”وہ سارا دن گھر پر رہتا ہے آج چچا بھوسلے زبردستی بھیڑیں چرانے لے گیا ہے۔“

”سارا دن گھر پر کیا کرتا ہے وہ؟“

”مورتیاں بنایا کرتا ہے۔“

”مورتیاں؟ وہ کیسی؟“

اس نے نین مورتیاں بنائی ہیں بالکل موتی جیسی۔ لیکن تیسری سب سے

خوب صورت ہے۔“

رندھیر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ موتی کی مورتی بنانا ایک اچھوت کا ایسا جرم نہ تھا جسے وہ آسانی سے معاف کر سکتا۔ اسے تھوڑی دیر کے لیے اپنی تمام گزشتہ سوچا

پر شرم و ذرا مت محسوس ہونے لگی۔ مادھو اسے قابل نفرت نظر آنے لگا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ موتی اور مادھو کے درمیان اگر میں ایک زنجیر کا کام نہ دیتا تو مادھو کو یہ جسارت نہ ہوتی۔ اور اب یہ معاملہ ایک خطرناک حد تک پہنچ چکا ہے۔ موتی کو بدنامی سے بچانا میرا فرض ہے۔ میں مادھو کو سمجھا سکتا ہوں اور اگر موتی کو اس کے ساتھ کوئی دلچسپی ہے تو وہ ہمدردی محنت و دوسرے اسے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ ایک اچھوت اس کی مورتیاں بنا رہا ہے تو وہ اسے عمر بھر معاف نہیں کرے گی۔ لیکن میں بھی تو مادھو سے مختلف نہیں میں نے بھی تو آج تک یہ نہیں سوچا کہ میرے اور ایک اچھوت لڑکی کے درمیان ایک ایسی حسیلج عامل ہے جسے پاٹا نہیں جاسکتا۔ اس کے باوجود میں مستقبل کے نتائج سے بے پروا اس کے پیچھے بھاگا پھرتا ہوں۔ کیا مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ سماج کی بیڑیاں توڑ سکوں؟ اس لڑکی کے لیے چنڈال کہلاتا گوارا کر لوں گا؟ ان سوالات کے جواب میں اس کا ضمیر بکا رہا تھا۔ نہیں رندھیر! انہیں! اتم مادھو کی طرح خود فریبی مبتلا ہو۔ تم شانتا کو ایک کھیل ایک عارضی دلچسپی سمجھتے ہو۔ تم صرف اس سے کہتے ہوئے پھول سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو لیکن تم اسے دل پر اس کی محبت سے کہیں زیادہ سماج کا احترام اور اگر احترام نہیں تو خوف سوار ہے۔ تم جن پاؤں چل کر اس طرف آئے ہو انہیں پاؤں والے چلے جاؤ گے اور پھر اس لڑکی کا کیا ہوگا۔ کیا تم راپریم اس کے لیے ایک زہر کا پیالہ نہ ہوگا؟

رندھیر نے غموم نگاہوں سے شانتا کی طرف دیکھا۔ وہ فکر مند سی ہو کر بولی۔  
”آپ مورتی کے متعلق سوچ رہے ہیں؟“

اس نے جواب دیا ”ہاں مورتی کے متعلق میں سوچ رہا تھا کہ.... شانتا! تم کو کہ میں یہاں دوبارہ نہ آ سکوں تو.... تم کیا محسوس کرو گی؟“

شاننا کی تمام حیات سہٹ کر اس کی آنکھوں میں آگئیں۔ وہ چہرہ جو ایک لمحہ پیشہ کائنات کی مسرتوں کا گہوارہ تھا، حزن و ملال کی تصویر بن گیا۔ دھڑکتے ہوئے دل کی انگلیں، حوصلے اور ولولے، التجائیں بن کر رہ گئیں۔ اور یہ التجائیں کانپتی ہوئی آواز بن کر زبان تک پہنچیں۔ ہونٹ تھر تھرتھرتھنے لگیں۔ کانپے اور ایک دوسرے سے پرست ہو کر رہ گئے۔ شاننا کچھ کہہ نہ سکی۔ اور التجائیں آنکھوں میں آنسو بن کر چھلکنے لگیں۔ شاننا نے سر جھکا لیا۔ اور میلے دوپٹے کے ساتھ آنسو پونچھ کر نیچے دیکھنے لگی۔

اچانک اسے گھاس میں کوئی متحرک شے نظر آئی اور اس کے جسم میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو گیا۔ آنکھوں سے حزن و ملال کی بجائے خوف و ہراس ٹپکنے لگا۔ ایک اٹھی گھاس سے اوپر سر نکالے رندھیر کی ٹانگ کے بالکل قریب اچکا تھا۔ شور مچانے کا موقع نہ تھا۔ شاننا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھی اور رندھیر کو دھکامے کر ایک طرف ہٹا دیا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے مزے سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھنے لگی۔ جس وقت رندھیر کی نظر سانپ پر پڑی۔ وہ پاس ہی ایک جھاری میں چھپ رہا تھا۔

رندھیر شاننا کی طرف متوجہ ہوا کیا ہوا؟ اس نے پوچھا۔

شاننا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: کچھ نہیں۔

رندھیر بولا: اُف بڑا خطرناک سانپ تھا۔ اگر تم دھکامہ دیتیں تو ضرور مجھے ڈس جاتا۔

شاننا حے کہا: میں نے سنا ہے کہ اس سانپ کے کاٹے ہوئے مرجاتے ہیں؟

ہاں! یہ بہت زہریلا ہے۔

”مرتے وقت تکلیف تو نہیں ہوتی؟“

”نہیں! کہتے ہیں کہ سانپ کے زہر سے نیند سی آجاتی ہے۔“

شاننا نے کہا: ”آپ کہتے تھے کہ آپ پھر یہاں نہیں آئیں گے؟“

”ہاں! لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہارا دل دکھے گا۔“

شاننا نے ہونٹوں پر نگین مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا: ”اب میرا دل نہیں دکھے گا۔ اب اگر آپ آئے بھی تو مجھے نہیں دیکھیں گے۔“

”کیوں شاننا! تم کہیں جا رہی ہو؟“

شاننا نے کچھ دیر توقف کے بعد غنودگی کی حالت میں آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا: ”شاید مجھے نیند آ رہی ہے۔۔۔۔۔ اس نیند سے شاید میری آنکھیں پھر نہ کھلیں۔“

رندھیر دوسرا سو ہو کر چلایا: ”شاننا! تمہیں سانپ۔۔۔۔۔؟“

”ہاں! مجھے سانپ ڈس گیا ہے لیکن میں خوش ہوں کہ آپ کے کسی کام آسکی۔“ شاننا یہ کہہ کر بیٹھ گئی اور اپنے ٹخنے کی طرف دیکھنے لگی۔

رندھیر ایک لمحہ کے لیے بھونچکا سا ہو کر رہ گیا اور پھر شاننا! شاننا! اکتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے منہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ شاننا کے پاؤں کو ٹوٹنے لگے۔ اس نے بے قرار سا ہو کر کہا: ”کہاں۔۔۔۔۔ شاننا کہاں؟“

شاننا نے ٹخنے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا: ”یہاں۔۔۔۔۔ یہ دیکھو!“

رندھیر کو ٹخنے پر سرخ نشان کے درمیان ایک چھوٹا سا آبلہ دکھائی دیا۔

اس نے درودھیری آواز میں کہا: ”شاننا! تم نے میرے لیے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالی؟“

شاننا نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ رندھیر کی طرف دیکھا اور جواب دیا:

”سانپ آپ سے بہت قریب تھا۔ اگر میں آپ کو پرے نہ ہٹا دیتی تو۔۔۔۔۔؟“

رندھیر کے دل میں اونچی ذات والوں کی نخوت کے قلعے کی مضبوط دیواریں جو پہلے ہی کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ اب نابود ہو کر رہ گئیں۔ اچھوت لڑکی اسے پہلی بار ایک

عورت دکھائی دی۔ وہ عورت جو اس کے لیے اپنی جان پر کھیل سکتی تھی۔ جو موت کی جیسا کہ صورت دیکھنے کے باوجود مسکرا سکتی تھی۔ اس کا دل کھڑکھڑاتا تھا۔ زندہ حیرا تم اس محبت اور اس ایثار کے حق دار نہ تھے۔ تم کچھ دیر پہلے سماج سے خوف زدہ ہو کر اس سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہونے کا ارادہ کر رہے تھے۔ تم بزدل ہو گئے۔ محبت اور خوف کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہوتے۔ محبت نفع اور نقصان نہیں دیکھتی اس لڑکی کو دیکھو جو سانپ کے ڈانسنے کے باوجود مسکراتی ہے۔ کاش اتم بھی اسی قدر بہادر ہوتے۔ لیکن اب کیا ہو گا؟ شانتا کی موت کے تصور سے اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس نے رنج و کرب میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "شاننا! چلو۔ تین گھر چھوڑ آؤں۔ یہاں سے آٹھ کوس کے فاصلے پر ایک سپیرا رہتا ہے۔ میں ابھی اسے لانا ہوں۔" شانتا نے غموں میں آواز میں کہا "سپیرا! وہ کیا کرے گا؟" سپیرا نے کہا "وہ زہر پیتے سے زہر پینے سانپ کے کانٹے ہوتے۔ کارہیوں میں لیتا ہے۔ لیکن میں نے سنا ہے کانٹے سانپ کے کانٹے کا کوئی علاج نہیں ہے۔" "نہیں! اس کے پاس ہر سانپ کا علاج ہے۔" شانتا اتم بچ جاو گی! لیکن آپ کہہ رہے تھے کہ آپ پھر یہاں نہیں آئیں گے۔" "جسٹ نہیں! میں سمجھوٹ کہتا تھا میں ہر روز یہاں آؤں گا۔ میں تمہارے لیے تمام دنیا چھوڑ دوں گا۔ میں تمہارا ہوں۔ ہمیشہ تمہارا۔" "اب رہو۔" زندہ حیرا کے ہر لفظ کے ساتھ شانتا کی سانس تیز ہوا رہی تھی۔ ایک سات پیشتر زندہ حیرا تھے مایوس ہو کر اسے اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے کاتہ کش ہونے پر کوئی ملال نہ تھا۔ بلکہ سانپ کے ڈس جانے کے بعد اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے زندہ حیرا پر آخری فتح حاصل کی ہے۔ لیکن اب زندہ حیرا کی زبان سے

محبت کے اعتراف کے بعد اس کے لیے اس دنیا کا ہر کانٹا ایک مہکتا ہوا پھول بن گیا۔ زندہ حیرا اس کا تھا اور وہ موت کے زبردست ہاتھوں سے چھٹکارا حاصل کر کے اس کی دنیا میں رہنا چاہتی تھی۔ پہلے زندہ حیرا کی محبت سے مایوس ہو کر اس کے لیے جیسا دشوار تھا لیکن اب زندہ حیرا کی محبت کے یقین کے ساتھ اس کے لیے مزاحمت نہ تھی۔ زندہ حیرا کی آواز نے موت کا چہرہ بے حد جلیا نکھینا دیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "موت بھرتے ہوئے پوچھا۔" وہ سپیرا اسے جانے گا؟" "یہاں سے چلو۔" "میں اسے ضرور ملاؤں گا لیکن جلدی چلو۔" شانتا اٹھی اور زندہ حیرا اس کا بازو پکڑ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے کہا "میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے۔ فوراً آہستہ چلو۔" "نہیں! شانتا! ہمیں جلدی پہنچنا چاہیے۔" شانتا نے کچھ دُور اور اس کی تیز رفتاری کا ساتھ دیا لیکن اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ دو تین بار اس کے پاؤں کو تھوڑی کی ٹھوکریں لگیں اور زندہ حیرا اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر جھونپڑی کی طرف بھاگنے لگا۔

شاننا کو اس حالت میں دیکھ کر کنڈلی کی آنکھیں کھل کی کھلی رو گئیں۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور زندہ حیرا کی طرف دیکھنے لگی اس میں زبان ہلانے یا آگے بڑھنے کی ہمت نہ تھی لیکن ماستا جو اسی پر جلدی غالب آگئی۔ اس نے کہا "تم کون ہو؟" شانتا کو کیا ہوا؟

زندہ حیرا نے شانتا کو چار پائی پر لٹاتے ہوئے جواب دیا "اے سانپ نے

کنول کی طرف دیکھا۔ اور اس سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وقت کی نزاکت کے لحاظ سے خاموش رہا۔ اس نے کہا: "اچھا اب میں جاتا ہوں۔ بہت جلد آؤں گا۔"

کنول نے پوچھا: "کہاں رہتا ہے سپیرا؟"

"یہاں سے آٹھ کوس دور۔"

"آٹھ کوس؟ پھر تو بہت دیر ہو جائے گی۔"

لیکن میرے پاس گھوڑا ہے۔ میں اسے جھیل پر چھوڑ آیا ہوں۔

زندہ میر جھوڑی سے نکلا اور پوری رفتار سے جھیل کی طرف بھاگا۔ بادل تمام آسمان پر قبضہ جما چکے تھے۔ جھیل پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ گھوڑا اپنی جگہ موجود نہیں۔ وہ گھوڑے کے غائب ہونے کی مختلف وجوہات سوچتا ہوا گھیرے سے گھبرا گیا۔

گھوڑا لینے کے ارادے سے شہر کی طرف بھاگا لیکن درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلتے ہی اس نے دیکھا کہ شکر گھوڑے کی لگام پکڑے شہر کی طرف جا رہا ہے۔

سرکش گھوڑا نہر قدم پر پہنچا۔ پاؤں ہاتھ اور شکر خوف زدہ ہو کر ایک ہاتھ سے اس کی لگام پکڑے۔ وہ سرے ہاتھ سے چھڑی ہلا کر اسے دودھ کھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

آج پھر شہر میں فوراً پہنچنا شکر کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ آج وہ بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ زندہ میر رام داس کا بیٹا ایک اچھوت لڑکی کے پاؤں چھو رہا تھا اور اسے دیوانوں کی طرح اٹھا کر سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ اے کاش زندہ میر تقویٰ ویر اور جھوڑی میں رہے لیکن یہ سرکش گھوڑا، یہ بد معاش! یہ ضدی باد بیوقوف جانور! جو ایک انسان کا بوجھ اٹھا کر ہوا کی طرح بھاگ سکتا تھا۔ شکر کی بد قسمتی سے آج آگے بڑھنے کی بجائے اٹے پاؤں چلنے کی مشق کر رہا تھا۔ یہ گھوڑا اس نے اس نیت سے اپنے ساتھ لیا تھا کہ زندہ میر اس سے پہلے گھر پہنچ جائے۔ اسے یہ بھی خیال تھا کہ گھوڑے کو بطور ثبوت پیش کرنے کے بعد وہ رام داس کو باقی تمام باتیں

کہے گا۔

کنول یہ سن کر میری بیٹی! میری شانتا! اکہتی ہوتی شانتا کی طرف بڑھی اور اسے ہوش میں لانے کے لیے جھنجھوڑنے لگی۔

شانتا نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا: "ماتا! مجھے سنوئے دو! کیا بات ہے؟"

"بیٹی بتاؤ! کہاں کا ٹاسپ نے؟"

شانتا نے لیٹے لیٹے ٹانگ سیکر کر ہاتھ کی انگلی ٹخنے پر رکھ دی اور کہا:

"یہاں۔"

ٹخنے پر چھوٹا سا آداب کافی ابھرا تھا۔

زندہ میر نے تسلی دیتے ہوئے کہا: "آپ فکر نہ کریں! میں ابھی سپیرا کے کو

کنول نے کہا: "یہ آداب کاٹ دیا جائے تو اچھا ہو گا۔"

خدا! وہ مجھے معلوم نہ تھا۔ لابیے کوئی تیز چیز! میں اسے اپنے ساتھ بھجوا بھی نہیں لایا۔

کنول نے پریشان ہو کر کہا: "کلباڑیاں بدھو اور مادھو لے گئے ہیں اور کوئی تیز چیز گھر پر نہیں۔ ہاں ایک چیز ہے۔ اس کی نوک کافی تیز ہے۔ کنول بھاگتی ہوئی جھوڑی میں گئی اور نیام سمیت ایک تلوار اٹھا لائی۔ نیام اگرچہ بہت پرانا تھا، لیکن کنول نے جب تلوار نکالی تو وہ چمک رہی تھی۔

کنول نے زندہ میر سے ہاتھ میں تلوار دیتے ہوئے کہا: "مجھ سے کاٹا نہیں چلتے۔ گاتم کاٹ دو۔ جلدی کرو۔"

زندہ میر نے جلدی سے تلوار کی نوک سے آبد چیر دیا۔ تلوار نیام میں ڈالنے پر اسے ذلت پر اپنے باپ کے نام کے حروف دکھائی دیے۔ اس نے حیران سا ہر

کنول کی طرف دیکھا۔ اور اس سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وقت کی نزاکت کے لحاظ سے خاموش رہا۔ اس نے کہا: "اچھا اب میں جاتا ہوں۔ بہت جلد آؤں گا۔"

کنول نے پوچھا: "کہاں رہتا ہے سپیرا؟"

"یہاں سے آٹھ کوس دور۔"

"آٹھ کوس؟ پھر تو بہت دیر ہو جائے گی۔"

لیکن میرے پاس گھوڑا ہے۔ میں اسے جھیل پر چھوڑ آیا ہوں۔

زندہ میر جھوڑی سے نکلا اور پوری رفتار سے جھیل کی طرف بھاگا۔ بادل تمام آسمان پر قبضہ جما چکے تھے۔ جھیل پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ گھوڑا اپنی جگہ موجود نہیں۔ وہ گھوڑے کے غائب ہونے کی مختلف وجوہات سوچتا ہوا گھیرے سے گھبرا گیا۔

گھوڑا لینے کے ارادے سے شہر کی طرف بھاگا لیکن درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلتے ہی اس نے دیکھا کہ شکر گھوڑے کی لگام پکڑے شہر کی طرف جا رہا ہے۔

سرکش گھوڑا نہر قدم پر پہنچا۔ پاؤں ہاتھ اور شکر خوف زدہ ہو کر ایک ہاتھ سے اس کی لگام پکڑے۔ وہ سرے ہاتھ سے چھڑی ہلا کر اسے دودھ کھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

آج پھر شہر میں فوراً پہنچنا شکر کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ آج وہ بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ زندہ میر رام داس کا بیٹا ایک اچھوت لڑکی کے پاؤں چھو رہا تھا اور اسے دیوانوں کی طرح اٹھا کر سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ اے کاش زندہ میر تقویٰ ویر اور جھوڑی میں رہے لیکن یہ سرکش گھوڑا، یہ بد معاش! یہ ضدی باد بیوقوف جانور! جو ایک انسان کا بوجھ اٹھا کر ہوا کی طرح بھاگ سکتا تھا۔ شکر کی بد قسمتی سے آج آگے بڑھنے کی بجائے اٹے پاؤں چلنے کی مشق کر رہا تھا۔ یہ گھوڑا اس نے اس نیت سے اپنے ساتھ لیا تھا کہ زندہ میر اس سے پہلے گھر پہنچ جائے۔ اسے یہ بھی خیال تھا کہ گھوڑے کو بطور ثبوت پیش کرنے کے بعد وہ رام داس کو باقی تمام باتیں

نہنے پر آمادہ کر سکے گا لیکن یہ گھوڑا ہواش اس کا منہ آج دم کی طرف لگ جائے۔  
 رندھیر کی آواز آئی "شکر ٹھہرو! شکر ٹھہرو! اور شکر کے سر پر بجلی گر پڑی  
 اور پیٹ میں ناچنے والے چڑھے دیک کر رہ گئے۔  
 گھوڑا رندھیر کی آواز سن کر سنبھلتا اور پھیلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔  
 رندھیر کی دوسری آواز آئی "کہاں لے جا رہے ہو اسے؟ اسے کہیں چھوڑ دینا

اسے اس کی لگام اور پر سے پکڑو۔  
 شکر بڑبڑایا "جی ہاں! جیسے اس کے منہ میں دانست ہی نہیں۔  
 رندھیر نے قریب پہنچ کر گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور غصے سے بولا "اہمیت  
 بے وقوف ہو تم۔ آخر تم نے وہاں سے اسے کھولا کیوں؟  
 شکر نے طنز یہ لہجے میں جواب دیا "جی میں سمجھتا تھا کہ آپ شاید اس چھو  
 لہکی کے پر میں اس بیچا پسے کو بھول گئے ہیں۔  
 رندھیر نے بگڑ کر کہا "دیکھو شکر! مندر سے باہر تیار کوئی کام نہیں اگر تیار  
 منہ سے ایک لفظ بھی نکلا تو پھر مجھے یہ خیال نہ ہوگا کہ تم برہمن ہو۔  
 رندھیر کو دیکر گھوڑے پر سوار ہوا اور آن کی آن میں شکر کی نظروں سے  
 غائب ہو گیا۔

## سپیرا

آسمان پر مختلف رنگوں کے بادلوں کی تہیں ہموار ہو کر ایک دھندلے رنگ  
 کے پردے میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ کوئی پانچ گھنٹے کے بعد رندھیر کو  
 موسلا دھار بارش نے آیا۔ ٹیلوں اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے نشیب و فراز سے  
 گزرنے کے بعد اس کے سامنے کسی حد تک ہموار میدان تھا۔ آخری کوس میں اسے  
 کسی چھوٹی چھوٹی ندیاں عبور کرنی پڑیں۔ وہ کچھڑ اور پانی سے لت پت شودروں  
 کی ایک چھوٹی ٹہنی بستی میں جو ایک ٹیلے پر آباد تھی داخل ہوا، اور ایک جھونپڑی  
 کے قریب پہنچ کر آوازیں دینے لگا: "اے کوئی ہے۔ کوئی ہے؟"  
 ایک عورت نے دروازے سے منہ نکال کر باہر جھانکا اور ہمیشہ اس کے کہ  
 رندھیر اس سے کوئی بات کرنا وہ اٹھنے پاؤں والی چلی گئی۔ عورت کے جاتے ہی  
 ایک نوجوان نمودار ہوا اور گھوڑے کے منہ قناعت سے اس سوار کی اہمیت کا اندازہ  
 لگا کر جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔

رندھیر نے سوال کیا "یہاں کوئی سپیرا رہتا ہے؟"

جی ہمارا لاج! اس کی جھونپڑی اس طرف بڑکے درخت کے سامنے ہے۔  
 لیکن آج وہ یہاں نہیں۔ اگر آپ بارش میں آرام کرنا چاہیں تو ہماری جھونپڑی حاضر  
 ہے لیکن ہم اچھوت ہیں۔ شاید آپ!  
 رندھیر نے کہا "مجھے تمہاری جھونپڑی سے نفرت نہیں۔ لیکن میں آج ہی سپیرا

کو تلاش کرنا چاہتا ہوں وہ کہاں گیا ہے؟

نوجوان نے جواب دیا "وہاں تو آپ آج نہیں پہنچ سکتے اسے آج صبح چند آدمی کسی کے علاج کے لیے دریا کے پار لے گئے ہیں۔"

لیکن یہ بہت ضروری ہے وہ بستی کتنی دور ہے؟

بستی تو دور نہیں۔ وہ دریا کے پار نظر آتی ہے لیکن ایسی بارش میں پتہ نہیں۔

کس وقت پانی چڑھ جاتے۔ آج کوئی دریا میں کشتی ڈالنے کی ہمت نہیں کرے گا۔

زندہ حیرت دہ سے ناپوس ہو کر گھوڑے سے اترا اور نوجوان کے کندھے پر

ہاتھ رکھ کر بولا "دیکھو! یہ کسی کی زندگی کا سوال ہے۔ میں تمہاری مدد چاہتا ہوں مجھے

کسی طرح دریا کے پار پہنچا دو۔"

نوجوان مذہب سنا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

زندہ حیرت دہ اپنے ہاتھ کی انگلی سے سونے کی انگوٹھی اتاری اور کہا "یہ لے لو"

اس وقت میز سے پاس اور کچھ نہیں۔

شوہر کے لیے اس کے کندھے پر اونچی ڈانٹ کے ایک ہاف نوجوان کی

شفقت کا ہاتھ اس انگوٹھی سے کہیں زیادہ قیمتی تھا۔ اس نے کہا "مجھے اس کی ضرورت

نہیں۔ میری کشتی حاضر ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر طغیانی آگئی تو ہمیں اپنے بازوؤں

پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔"

زندہ حیرت دہ نے پرامید ہو کر جواب دیا "میں طغیانی میں بھی دریا کو عبور کر سکتا ہوں"

صرف اس سپرے کو لانے کے لیے کشتی لے جانا ضروری سمجھتا ہوں۔

نوجوان نے کہا "وہ پانی سے کچھ ڈرتا ہے لیکن شاید آپ سے انکار نہ کرے"

خیر دیکھا جائے گا ہم اسے زبردستی بھی لاسکتے ہیں۔ چلیے! میں آپ کا گھوڑا لکھڑ

میں باندھ دیتا ہوں۔ دریا یہاں سے بہت قریب ہے۔"

نوجوان گھوڑے کو جھونپڑی کے اندر چھوڑ کر زندہ حیرت دہ کے ساتھ ہولیا۔ دونوں

بھاگتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچے۔ مابہی گیزوؤں کی چار چھوٹی چھوٹی کشتیاں جن

کے لیے کنارے پر کھڑی کی میخوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے پانی کی بہروں پر

چھکوتے کھا رہی تھیں۔ نوجوان مابہی گیر نے کشتی میں پڑا ہوا ایک مٹی کا ٹھیکر اٹھایا

اور کشتی کا پانی نکالتے لگا۔ زندہ حیرت دہ نے دوسری کشتی سے اتنی قدر کا ایک ٹھیکر اٹھایا

اور مابہی گیر کے ساتھ کام میں شریک ہو گیا۔ دونوں کو کشتی سے چند گھنٹے پانی نکال

کر دیا میں پھینکتے دیر نہ لگی۔

مابہی گیر نے رستہ گھولا اور بانس اٹھا کر کشتی پھینکنے لگا۔ زندہ حیرت دہ "پانی ابھی

پر حوا تو نہیں؟"

نہیں! ابھی طغیانی نہیں آئی۔ پھر بھی پانی کافی تیز ہے۔"

ملاح کو منہ جدار میں پہنچ کر چند مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن وہ ہر گز

پہنچنے اور نہر بھرنے سے ہٹنے کے بعد یہی کہتا "سرکار! یہ تو کچھ بھی نہیں میں نے بڑے

بڑے طوفانوں کا مقابلہ کیا ہے اب وہاں ہمیں دیر نہ لگے تو اچھا ہو گا پانی آہستہ

آہستہ چر لے رہا ہے۔"

دوسرے کنارے پر پہنچ کر مابہی گیر نے کشتی کا رتا ایک پتھر کے ساتھ

باندھ دیا اور دونوں بھاگتے ہوئے کنارے سے کوئی دو سو قدم دور ایک تہی میں

داخل ہوئے۔ مابہی گیر نے ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ گاؤں

کے چودھری کا گھر ہے۔ چلیے! آپ یہاں بیٹھیں۔ میں سپرے کا پتہ کرتا ہوں۔"

زندہ حیرت دہ نے جواب دیا "نہیں، تم پہلے یہ معلوم کرو کہ وہ کس گھر میں ہے۔ میں

تہا سے ساتھ چلتا ہوں۔

ماہی گیر جھونپڑی کے اندر داخل ہوا اور تھوڑی دیر بعد ایک عمر رسیدہ آدمی کو ساتھ لیے باہر نکلا۔ یہ گاؤں کا چودھری تھا۔ اس نے رندھیر کو دیکھتے ہی دوسرے ہاتھ باندھ کر پوچھا کیا مہاراج! آپ یہاں اور ایسے موسم میں! چلتے آپ اندھیرے میں سپرے کو بلاتا ہوں۔  
نہیں، میں تمہارے ساتھ چلوں گا مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔  
بہت اچھا سزاوار۔ جواب کی آگیا۔ چلیے! رندھیر نے چلتے چلتے پوچھا وہ جن مریض کے علاج کے لیے یہاں آیا تھا اس کی اب کیسی حالت ہے؟

سرکار! وہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ آج پتہ نہیں کس چیز سے اس کے ہاؤں پر چھالا پڑ گیا۔ وہ ماں باپ کا ایک ہی لڑکا ہے اس کی ماں نے چھالا دیکھتے ہی مانی مچادی کہ میرے بچے کو سانپ کاٹ گیا ہے اور وہ لڑکا بھی عجیب بے وقوف ہے۔ ہم گئے تو لمبتر پریٹ کر اونگھ رہا تھا۔ ہم جا کر سپرے کو لے آئے تو وہ بھنگ پی کر ہم سب کو گالیاں دے رہا ہے۔ تم سب بد معاش ہو تم نے مجھے بارش میں خراب کیا ہے۔

رندھیر نے کہا "میں نے سنا ہے کہ وہ ہر قسم کے سانپ کا علاج کر لیتا ہے۔" سرکار! اس میں شک نہیں وہ پاگل جیسا ہے لیکن ہم نے یہی دیکھا ہے کہ وہ سانپ کے ڈسے ہوئے کے پاس وقت پر پہنچ جاتے۔ تو پھر اسے مرنے نہیں دیتا؟

(۱۳۱)

پتیلوں باتیں کرتے ہوئے ایک جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ سپرے گاؤں کے چند آدمیوں کے درمیان بیٹھا بھوتوں، پھر لیکن اور سانپوں کی داستانیں سن رہا تھا اس کا ایک چھیلے سے بھنگ کا ایک کونڈا پلا چکا تھا اور دوسرا زکڑ کر تیار کر رہا تھا چودھری نے سپرے کے قریب جا کر آہستہ سے اس کے کان میں کچھ کہا اور اس نے سر ہلاتے ہوئے اونچی آواز میں جواب دیا "نہیں!۔ کبھی نہیں!۔ ہرگز نہیں!۔" اس وقت راجہ بھی چل کر آئے تو بھی نہیں جاؤں گا۔ چودھری نے کھسیانا سا ہو کر باقی لوگوں کی طرف دیکھا اور کہا تم جانتے ہو یہ کون ہیں؟ یہ بیاس کے پار اونچی ذات والوں کے شہر کے رہنے والے ہیں۔ اور اس ملک میں اس شہر کا سردار ہی ایک ایسا آدمی ہے جو ہماری قوم سے نفرت نہیں کرتا جب اسے معلوم ہو گا کہ شہر سے اونچی ذات کا ایک آدمی ایسی حالت میں دریا عبور کر کے ہماری قوم کے ایک سپرے کو بلانے کے لیے آیا اور اس نے کرا جواب دیا تو اسے یقیناً دکھ ہو گا۔

لوگ یہ سن کر ایک دوسرے سے کانٹا پھوسی کرنے لگے اور چودھری سپرے سے مخاطب ہوا "کالو! جانتے ہو یہ لوگ تمہیں بیڑیاں پہنا کر بھی لے جاسکتے ہیں رندھیر نے چودھری کی گفتگو کو ذرا زیادہ مؤثر بنانے کی نیت سے کہا "شہر کے سردار میرے پتا ہیں۔ تاہم میں انہیں مجبور نہیں کر سکتا تبے شک انہیں بارش میں تکلیف ہو گی لیکن جس کی جان بچانے کے لیے میں انہیں لے جانا چاہتا ہوں آپ کی قوم کی ایک لڑکی ہے۔ اس نے میرے پیروں میں سانپ دیکھ کر میری جان بچانا چاہی اور سانپ نے اسے ڈس لیا۔"

سردار کے بیٹے کے سامنے لوگ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور چودھری نے کہا "ہمارا ج! آپ کے لیے ہم سب کی جانیں حاضر ہیں اور پھر سپرے سے مخاطب ہوا "کالوا! اٹھتے ہو یا ہم زبردستی اٹھائیں؟"

کالو کے دماغ سے بھنگ کے اثرات ابھی زائل نہ ہوئے تھے تاہم لوگوں کے تیور دیکھ کر اس کی جرات خوف میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس نے گھگھیا کر کہا "دیکھو! مجھے بارش میں باہر نہ نکالو۔ میں مر جاؤں گا۔ دریا میں کشتی اٹ جائیگی اور مجھے..... مجھے مگر چھپ کھا جائیں گے۔ تم نے مگر مجھ نہیں دیکھے، میں نے دیکھے ہیں یہ دریا مگر چھپوں سے پٹا پڑا ہے۔" سپرے کو بھنگ کے نشے میں جھونپڑی میں تمام آدمی مگر چھپ نظر آنے لگے۔ وہ چلا یا۔ دیکھو یہ مگر چھپ! مگر چھپ! اور اٹھ کر جھونپڑی کے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔

چودھری نے کہا "اس نے آج بھنگ بہت زیادہ پی ہے لیکن ہم اس کا نشہ اترنے کا انتظار نہیں کر سکتے۔ بارش میں اس کا دماغ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ چھپو! تم اس کا تھیلہ اٹھا لو۔"

ایک شخص نے سپرے کا تھیلہ اٹھالیا اور چودھری اور چار نوجوان اسے زبردستی پکڑ کر باہر لے آئے۔ سپرے نے کچھ دیر ہاتھ پاؤں ماسے۔ گالیاں دیں لیکن نوجوانوں کی آہنی گرفت اور مسلسل دھار بارش نے جلد ہی اس کا دماغ ٹھنڈا کر دیا اور اس نے کہا "اچھا! مجھے چھوڑ دو۔ میں چلتا ہوں۔"

کنائے پر پہنچ کر رندھیر کو معلوم ہوا کہ دریا کے تیور بدلے ہوئے ہیں۔ وہ پتھر جس کے ساتھ کشتی کا رسا باندھا گیا تھا پانی میں ڈوب چکا تھا۔ نوجوان ملاح کے پہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر رندھیر نے چودھری کی طرف دیکھا اس نے کہا "ملاح! خطرہ تو ہے لیکن میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں آپ تیرنا جانتے ہیں نا؟"

رندھیر نے جواب دیا "تم میری فکر نہ کرو میں پانی سے نہیں ڈرتا اور اس لڑکی کی جان بچانے کے لیے میں ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں۔"

سپیرا یہ سن کر شور مچانے لگا "مجھے تیرنا نہیں آتا میں ڈوب جاؤں گا۔ مجھ پر رحم کرو۔" لیکن لوگوں نے اسے زبردستی کشتی میں ڈال دیا۔

اس کشتی میں صرف ایک بانس تھا چودھری نے ایک شخص سے دوسرا بانس لے لے کے لیے کہا وہ بھاگ کر نزدیک ہی ایک کشتی سے دوسرا بانس لے آیا۔ رندھیر سپرے کے قریب بیٹھ گیا اور چودھری اور نوجوان ماہی گیر کشتی کیلئے لگے۔

جس وقت یہ دونوں ملاح دھاسے کی خطرناک موجوں کا مقابلہ کر رہے تھے سپرے نے رازدارانہ لہجے میں رندھیر سے پوچھا "سچ کہو تمہیں تیرنا آتا ہے؟" رندھیر نے جواب دیا "آتا ہے۔"

سپیرے نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا "پھر یہ بد معاش ضرور کشتی ڈبو دیں گے۔" وہ کہیں "؟"

"بس انہیں مجھ سے بیر ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں ڈوب جاؤں گا تو انہیں کوئی پرچہ گا۔ اگر آپ تیرنا نہ جانتے تو انہیں آپ کی حفاظت کا خیال ہوتا لیکن اب انہیں اطمینان ہے کہ آپ تیر کر بچ جائیں گے اور یہ بد معاش کشتی اس طرح چلا ہے میں جیسے یہ دریا انہیں کوئی جوہڑ ہے۔"

رندھیر نے سپرے کو تسلی دینے کی نیت سے کہا "تیرنا مجھے بھی نہیں آتا میں صرف مذاق کر رہا تھا۔"

"تو پھر ان سے کہو نا کشتی ہوشیاری سے چلا تیں۔"

"انہیں ہم سے زیادہ ٹکر ہے۔"

"سناک فکر ہے۔ ان لوگوں کا آپ کو اس وقت پتہ لگے گا جب کشتی

الٹ جاتے گی۔ وہ لہر آرہی ہے، وہ بھنور اگیا اور وہ دیکھو کیا آ رہا ہے۔ اسے  
مگر مجھ! وہ ایک بہتی ہوئی لکڑی دیکھ کر چلانے لگا۔

چودھری کے تجربے اور نوجوان ماہی گیری کی ہمت نے کشتی کو صحیح سمت  
دوسرے کنارے پر پہنچا دیا اور یہ چاروں بھاگتے ہوئے بسنی میں داخل ہو گئے  
نوجوان جھونپڑی سے گھوڑے لے آیا۔ سپرے نے کہا "اب تو شاہ  
والی ہے ہم شہر کیسے پہنچیں گے؟"

زندھیر نے کہا "آپ گھوڑے پر میرے پیچھے بیٹھ جائیں ہم ابھی پہنچ جائیں گے"  
"بابا! بابا! میرا بابا، میرا دادا، میرے دادا کا دادا ابھی گھوڑے  
پر سوار نہیں ہوا۔ اور یہ گھوڑا انہیں یہ تو کوئی جن ہے۔ میرا تاقاس کی شکل دیکھ کر  
دم نکل رہا ہے۔"

چودھری نے زندھیر سے کہا "آپ گھوڑے پر چڑھ کر یہ تمھیں پکڑ لیں۔  
ہم اسے آپ کے پیچھے لا دیتے ہیں۔"

زندھیر نے جلدی سے گھوڑے پر بیٹھ کر تمھیں پکڑ لیا اور چودھری اور  
اس کے ساتھی نے چیختے چلاتے سپرے کو اٹھا کر اس کے پیچھے لا دیا۔  
زندھیر نے رخصت ہونے سے پہلے ان دونوں کی طرف دیکھا اور کہا  
"میں تمہارے نام پوچھ سکتا ہوں۔"

نوجوان ملاخ نے جواب دیا "میرا نام تمھو ہے۔" اور چودھری بولا "میرا  
نام دھرمو ہے۔" ہمیں افسوس ہے کہ آپ بارش میں آئے اور بارش میں جا رہے  
ہیں۔ ہم آپ کی کوئی سیوا نہ کر سکے۔"

آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اب بھگوان سے التجا کریں  
اس کی جان بچ جائے۔ میں آپ سے پھر کبھی ملوں گا۔"

زندھیر نے گھوڑے کی باگ ذرا ڈھیلی کی اور سپرے اخوت زدہ ہو کر اس  
کی کمر کے ساتھ لیٹ گیا۔ دھرمو نے چند قدم گھوڑے کے ساتھ بھاگتے ہوئے  
کہا "کالو! ہم سے ناراض نہ ہونا۔ تم ایک اچھے کام کے لیے جا رہے ہو۔ اگر تم  
اس لڑکی کی جان نہ بچا سکتے تو ہم سب کی بدنامی ہو گی۔"

گھاؤں سے باہر نکل کر زندھیر نے گھوڑے کو ایڑ لگاتی اور وہ ہولے ہولے باتیں  
کرنے لگا۔ سپرے اچلا رہا تھا "آہستہ! آہستہ! آہستہ!! تمہیں اپنے بھگوان کی قسم!  
اپنے دیوتاؤں کی قسم!!"

نصف راستہ طے کرنے کے بعد زندھیر کو رات کی تاریکی نے آ لیا۔ اور اس  
نے گھوڑے کی رفتار آہستہ کر دی۔ بارش کا زور قدرے کم ہو چکا تھا لیکن تاریکی  
میں ایک قدم آگے دیکھنا دشوار تھا اور آخری دو کوس کے ٹیلے اور پہاڑیاں ایک  
دوسرے سے بہت مشابہ تھے اس لیے زندھیر نے صحیح راستہ تلاش کرنے  
کی ذمہ داری گھوڑے کی فراست پر چھوڑ دی۔

جب گھوڑا راستے کے آخری ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ زندھیر کا دل دھڑکنے  
لگا اور وہ انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ شاننا کے لیے دعائیں مانگنے لگا۔  
جھونپڑی کے قریب پہنچ کر جب اسے کوئی آواز سنائی نہ دی تو اسے کچھ تسلی ہوئی  
بدھو اور ماہو گھوڑے کی آہٹ پا کر جھونپڑی سے باہر نکلے۔ ماہو نے  
آواز دی۔ کون زندھیر؟

اس نے بے قراری سے پوچھا "شاننا کیسی ہے؟"  
"اسے ہوش نہیں۔" ماہو نے آگے بڑھ کر زندھیر کے گھوڑے کی لگا  
پکڑ لی۔ اور پوچھا "سپرے انہیں آیا؟"

"یہ میرے پیچھے ہے اسے اتارو!"

بدھونے آگے بڑھ کر سپیرے کو اترنے کے لیے سہارا دیا۔ زندھیر نے  
تھیلہ مادھو کو تھادیا اور نیچے اتر کر کہا: "اسے کہاں باندھوں؟"  
بدھونے گھوڑے کی لگام اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا: "میں اسے چھتر  
کے نیچے باندھ آتا ہوں۔ مادھو! تم انہیں اندر لے چلو!"

(۴۲)

چراغ کی دھندلی روشنی میں زندھیر کو شاننا ایک چارپائی پر بے ہوش لیٹی  
ہوتی دکھائی دی۔ کنول اس کے سر پر بٹھی ہوئی تھی۔  
سپیرے نے پوچھا: "کہاں کا ٹاسا پڑے؟"  
کنول۔ مادھو اور بدھو اس سوال کا جواب دینا چاہتے تھے لیکن سب  
سے پہلے زندھیر نے اس کے ٹخنے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا: "یہاں۔ آبلے میں  
کاٹ ڈالو!"  
"بہت اچھا کیا تم نے۔ لڑکی بچ جائے گی۔ مجھے سانپ بھی زیادہ زہر ملا  
معلوم نہیں ہوتا۔"

سپیرے نے یہ کہتے ہوئے زخم پر مرنے رکھ دیا اور اسے چوس چوس کر تھو  
لگا۔ سوزش کے علاوہ شاننا کی پندلی زخم کے نزدیک سیاہ اور باقی سرخ ہو چکی تھی  
جب تک زخم سے سرخ خون نہ نکلا سپیرا اسے چوستا رہا۔ اس کے بعد اس  
نے اپنے تھیلے سے لکڑی کی ایک ڈبیا نکال کر کھولی اور اس میں سے سیاہ رنگ کا  
سفوف زخم پر چھڑک دیا۔ شاننا نے سفوف کی جلن سے کراہتے ہوئے آنکھیں  
کھولیں اور بستر پر ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔

سپیرے نے کہا: "اسے تھوڑی دیر کے لیے پکڑ لو۔"  
بدھونے اس کی ٹانگیں اور مادھو اور زندھیر نے اس کے بازو پکڑ لیے شاننا  
نے ان کے ہاتھوں کی گرفت میں بے بس سی ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور اس کی نگاہیں  
زندھیر کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ سپیرے نے کنول کی طرف دیکھ کر کہا: "تیار  
گھر میں گئی ہے تو جلدی سے گرم کر لاؤ!"

کنول نے ہاتھ کر ایک کوزے سے مٹی کی پیالی میں گھی نکالا اور جھونپڑی  
کے ایک کونے میں جو لے کے سامنے جا بیٹھی۔ چولہے میں مٹی لکڑی کا ایک سرا  
سلگ رہا تھا۔ کنول نے اس کے ساتھ دو لکڑیاں رکھ کر چھونکیں ماریں اور پیالی  
بھر کتی ہوئی آگ پر رکھ دی۔

سپیرے نے تھیلے سے دوسری ڈبیر نکالی اور اس میں سے ایک اور سفوف  
نکال کر اپنی تھیلی پر ڈالتے ہوئے کنول کو آواز دی: "بس لے آؤ اسے زیادہ گرم  
کرنے کی ضرورت نہیں۔ کنول گھی لے آئی اور اس نے کہا: "اٹھو بیٹی! یہ دوائی کھا  
کر گھی پی لو۔ بس کل تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

مادھونے ہاتھ کا سہارا دے کر شاننا کو بٹھا دیا۔  
شاننا نے کہا: "میں دوا کھا لیتی ہوں۔ گھی نہ پیوں گی۔ مجھے متلی ہو جائے گی۔"  
بدھونے کہا: "بیٹی! تمہیں دینا پڑے گا۔"  
کنول بولی: "شاننا بے وقوف نہ بنو۔"

شاننا نے مایوس سی ہو کر زندھیر کی طرف دیکھا اور اس نے صرف اتنا کہا:  
"بیٹی! شاننا! ان الفاظ میں ایک التجا تھی جسے وہ ٹھکانہ سکی۔ ایک حکم تھا جس  
سے انحراف اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ زندھیر کی خواہش پر وہ زہر کا پیالہ بھی چلو  
اتار سکتی تھی۔ شاننا نے مسکراتے ہوئے اپنا منہ کھولی دیا۔ سپیرے نے دوائی منہ

میں ڈالی اور کنول نے اپنے ہاتھ سے اسے گھی پلانا چاہا لیکن اس نے پیالی اپنے  
میں پکڑ لی اور گھی پی کر فحاشانہ انداز میں رندھیر کی طرف دیکھنے لگی۔ رندھیر خوش سے مسکرا  
رہا تھا۔

سیراز میں پر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے کوئی منتر پڑھنے لگا۔  
شانتا کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر رندھیر اس کے منتر سے زیادہ اس کی دوا  
کے اثر کا قائل ہو رہا تھا۔ تھکے ہوئے سیرے نے جلد ہی اپنا منتر ختم کر دیا۔  
شانتا کی حالت سے مطمئن ہو کر رندھیر کو اب بھوک اور تھکاوٹ محسوس ہونے  
لگی۔ بدھو ایک زمینی کش مکش میں مبتلا تھا۔ گھر میں روٹی، دودھ اور کھن کے علاوہ  
تازہ مچھلی کافی مقدار میں موجود تھی لیکن اسے رندھیر کو کھانے کی دعوت دینے کی جرات  
نہ ہوتی اور اس کی موجودگی میں سیرے سے پوچھنا بھی مناسب خیال نہ کیا۔ چھوت  
چھات کے علاوہ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ رندھیر سوئے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا  
کھانے کا عادی ہو گا۔ اگر بضرع خیال وہ اس کی دعوت قبول کر بھی لے تو بھی مٹی کے  
پیاؤں کو ہاتھ لگانا اس کی توہین ہو گی۔ لیکن سکھ دیو بھی کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ اسے مٹی  
کے برتنوں سے نفرت نہ تھی۔ یہ بھی شاید بالکل سکھ دیو جیسا ہے۔ شاید اسے بھی مٹی  
کے برتنوں سے نفرت نہ ہو۔ آخر پوچھ لینے میں کیا ہرج ہے اس خیال سے بدھو کو  
کچھ تسلی ہوئی اور رندھیر سے مخاطب ہونے کے لیے موزوں الفاظ سوچنے لگا لیکن پھر  
اسے خیال آیا کہ سکھ دیو، کنول کی وجہ سے مٹی کے برتنوں میں کھانے اور چھو نہ پڑیوں میں  
رہنے کے لیے مجبور تھا اور اسے کوئی مجبوری نہیں مگر شانتا؟ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ پھر  
اور شانتا ایک دوسرے کے لیے کنول اور سکھ دیو بن چکے ہوں۔ اس نے بیکے بعد دیگرے  
ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی خاموش نگاہیں گرد و پیش سے بے خبر ایک دوسرے  
کو کوئی پیام دے رہی تھیں۔ وہ پیام جو روز ازل سے ہر ذی روح انسان اپنی جنتاں

کو دیتا چلا آیا ہے۔ بدھو نے اپنے دل میں کہا: یہ جوڑا برا نہیں لیکن اس کا انجام؟  
کیا رندھیر شانتا کے لیے اتنی بڑی قربانی کرنے کے لیے تیار ہو گا!!

رندھیر نے کہا: میں اب گھر جاتا ہوں۔ پتا بہت پریشانی ہوئی گئی۔ میں صبح  
پھر آؤں گا۔

بدھو کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ رندھیر نے اپنی انگلی سے سونے کی انگوٹھی  
اتاری۔ اور سیرے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: آپ نے آج بہت دیا کی۔ میرے  
پاس اس رقت اور کوئی شے نہیں میں صبح پھر آؤں گا۔ جب تک شانتا اچھی نہ ہو  
آپ یہاں سے نہ جاتیں۔

سیرے نے سونے کی انگوٹھی کو بھوک کی نگاہوں سے دیکھا اور ہاتھ بڑھانے  
کا ارادہ کر رہا تھا کہ کنول بولی اٹھی: "نہیں! نہیں! یہ نہیں ہو گا۔ آپ اپنی انگوٹھی اپنے  
پاس رکھیں۔ آپ نے تم پر بہت دیا کی ہے۔ کنول نے اٹھ کر ایک پیاری کھولی  
اور ایک انگوٹھی نکال کر سیرے کو پیش کرتے ہوئے کہنے لگی:  
آپ کے احسان کا بدلہ ہم لوگ نہیں دے سکتے لیکن میرے پاس اس سے  
زیادہ قیمتی چیز اور کوئی نہیں۔ یہ شانتا کے باپ کی آخری نشانی ہے۔"

سیرے نے پوچھا: وہ مرچکا ہے؟  
"ہاں! کنول کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔"

سیرے نے کہا: "بیوہ کا دھن ہم پر حرام ہے تم اسے اپنے پاس رکھو۔"  
رندھیر نے سیرے کا ہاتھ پکڑ کر اس پر اپنی انگوٹھی رکھ دی اور اس نے چپکے  
سے سفوف والی دیبا میں رکھ کر اپنے تھیلے میں ڈال لی۔

کنول نے کہا: "بیٹا! تم یہ بہن کو در نہ مجھے دکھ ہو گا۔"  
رندھیر نے جواب دیا: "نہیں ماما! اسے اپنے پاس رکھیں، لیکن بدھو اور دھو

کے اصرار پر زہیر نے مجبوراً کنول کے ہاتھ سے انگوٹھی لے لی۔ انگوٹھی کو غور سے دیکھتے پر اسے چند حروف نظر آئے اور انہیں پیسے کی روشنی کے قریب جا کر پڑھنے کے بعد حیرانی اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ شانتا، مادھو اور کنول کی طرف دیکھنے لگا۔ انگوٹھی پر سکھ دیو کا نام کندہ تھا۔ وہ بتوار پر اپنے باپ کا نام پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ وہ اس انکشاف پر اپنی مسرت کو چھپانے لگا۔ اس نے پوچھا: "مادھو! تمہارے باپ کا نام سکھ دیو تھا؟"

"ہاں" مادھو نے جواب دیا۔  
زندہ حیر جوش مسرت میں مادھو کے ساتھ لپٹ گیا۔  
مادھو کو چھوڑ کر زہیر شانتا کی طرف متوجہ ہوا۔ "شانتا! میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں لیکن انکار نہ کرنا۔ یہ کہہ کر اس نے شانتا کا ہاتھ پکڑ کر اسے انگوٹھی پہنا دی اور کہا: "شانتا! تمہارے باپ کی نشانی تمہارے پاس رہنی چاہیے۔"

پھر وہ کنول کی طرف متوجہ ہوا۔ "ماتا! میں رام واس کا بیٹا ہوں۔ شاید اسے جانتی ہوں۔"

کنول کو جیسے اپنا بچہ ہوا ایسا مل گیا۔ اس نے پیار سے زہیر کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:  
"بیٹا تم وہی ہو دو برسوں کے دکھ درد کے ساتھ۔ رام واس نے ہمیں قید سے نکالا تھا اور تم نے میری بیٹی کی جان بچائی۔ جیتے رہو بیٹا!"  
سب سے آخر میں وہ مدھو کی طرف متوجہ ہوا۔ "اچھا اب میں جاتا ہوں صبح ضرور آؤں گا۔"

مدھو نے کہا: "چلیے! آپ کا گھوڑا چھپرے کی نیچے بندھا ہوا ہے۔"

زندہ حیر اور مدھو باہر نکلے تو شانتا نے پھر انکھیں بند کر لیں لیکن اس دفعہ

انکھیں بند کرنے کا باعث سانپ کا زہر نہ تھا بلکہ اس کے دماغ پر ایک سُرور کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ وہ کنول اور پیسے سے آنکھ بچا کر انگوٹھی دلے ہاتھ کو کئی بار سینے، ہونٹوں اور ہاتھوں تک لے گئی۔

بارش تھم چکی تھی اور آسمان پر کہیں کہیں بادل کی چھٹی ہوئی چادر میں سے ستارے جھانک رہے تھے۔ چھوٹی سی سے باہر چند قدم اٹھانے کے بعد مدھو اچانک ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ زندہ حیر نے پوچھا: "کیا ہے؟"

مدھو نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا: "وہ دیکھو! شاید کوئی آدمی جا رہا ہے؟"

زندہ حیر کو ایک سایہ درخت کی آڑ میں غائب ہوتا دکھائی دیا۔ اس نے آواز دی: "کون ہے ٹھہرا؟"

زندہ حیر کی آواز پر کسی کے بھاگنے کی آہٹ سنائی دی۔  
مدھو نے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آپ کا گھوڑا چرانے کے ارادے سے آیا تھا۔"

زندہ حیر آج دنیا کے تمام حیرانے لٹانے کے لیے تیار تھا اس نے جواب دیا: "تو مجھے افسوس ہے کہ وہ خالی ہاتھ جا رہا ہے۔"

مدھو نے کہا: "تم بالکل سکھ دیو کی طرح ہو۔"

(۵)

مدھو سے رخصت ہو کر زندہ حیر سیدھا گھر جانے کی بجائے جھیل پر پہنچا اور گھوڑے کو درخت کے ساتھ باندھ کر کچھ لمبے پت کپڑوں سمیت پانی میں

کو دھڑا۔

جب وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا تو صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔  
تھکا ہوا گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ زندہ حیر کے دل و دماغ پر ایک سرور  
کی کیفیت طاری تھی۔ وہ گزشتہ دن اور رات کے تمام واقعات کے متعلق بار بار  
سوچنے کے بعد یہ محسوس کر رہا تھا کہ شہر و دیوں کے متعلق جو رائے اس نے سماج  
کے اچھے ایوانوں میں رہ کر قائم کی تھی کس قدر غلط تھی۔ وہ اپنے دل سے بار بار  
پوچھ رہا تھا کہ دھرم اور تقویٰ جیسے انسانوں کو اچھوت کہنا پاپ نہیں؟ پہلے  
شہر میں کتنے لوگ ہیں جو دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر ایسی مروت اور ایثار سے  
پیش آتے ہیں۔ زندہ حیر کے دماغ میں شور کا مفہوم انسانوں کا وہ گروہ تھا جس کے  
تنگ و تاریک جھونپڑے محبت کے چراغوں سے روشن تھے۔

زندہ حیر تصور میں ایک ایسی دنیا تعمیر کر رہا تھا جس میں تمام انسان ایک  
ہی درجہ رکھتے تھے جس میں شہر اور دیہات ایک ہی صفت میں گھڑے تھے جس کا  
قانون ہر انسان کو چلنے اور پھرنے کی یکساں آزادی دیتا تھا جس کا مذہب تمام انسانوں  
کو نجات کی راہ دکھاتا تھا۔ جس کے مندروں کے دروازے ہر پکاری کے لیے کھلے  
تھے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور انتہائی خلوص کے ساتھ یہ دعا کی:

”بھگوان! تیری دنیا کو کسی ایسے انسان کی ضرورت ہے جو تیرے سادہ دل  
اور کمزور بندوں کو خود غرض انسانوں کے اقتدار سے نجات دلا سکے۔ یہ دنیا جس کی  
زینت کے لیے تو نے چاند، سورج اور ستارے بنائے ہیں جس میں دریا بہتے ہوئے  
چلتی، درخت لہلہاتے اور پھول کھلتے ہیں، کس قدر حسین ہے، لیکن کیا تو یہ گوارا  
کر سکتا ہے کہ اس زمین پر جس کی وسعت کا اندازہ کسی کو نہیں طاقت ور انسانوں  
کی ایک جماعت کمزور انسانوں کے لیے ایک دائمی عذاب بن کر ان کے لیے نڈھال کے

تمام راستے بند کر دے۔

بھگوان تیرے باغ میں اب ایسی خاردار جھاڑیاں آگ رہی ہیں جن کے نیچے  
ہزاروں نرم اور نازک پودے ہوا اور روشنی کے لیے ترس رہے ہیں۔ اب تیرے باغ  
کو ایک مالی کی ضرورت ہے جو ان جھاڑیوں کو کانٹ چھانٹ کر ان نرم و نازک  
پودوں کے برابر کر دے۔ ورنہ ان پودوں کی آبیاری کر کے ان جھاڑیوں کے برابر کر  
دے۔ بھگوان میں آج شہر و دیوں کے جھونپڑوں میں گیا ہوں ان کو چھوچکا ہوں اور  
میں خوش ہوں کہ آج میرے دماغ میں تیرا صحیح تصور آیا ہے۔ میں اپنے دل میں ایک  
نئی روشنی پاتا ہوں۔ لیکن میرے پاس کوئی ایسی مشعل نہیں جس سے دوسروں کو تیرا  
صحیح راستہ دکھا سکوں۔ بھگوان! اس ملک میں کوئی مشعل والا بھیج دے۔

دعا کے بعد زندہ حیر نے محسوس کیا کہ آنے والی صبح اس کے لیے ایک نئی زندگی  
کا پیام ہے۔ صبح صادق کی بڑھتی ہوئی روشنی میں سٹھنے والی تاریکی کی طرح مذہب اور  
انسانیت کے متعلق اس کے پرانے تصورات نئے خیالات کے لیے جگہ خالی کر  
رہے تھے۔ شہر کے قریب پہنچ کر اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں سماج کے اچھے  
ایوانوں کا وہ پہلا سا احترام تھا۔ خوف۔

شہر میں داخل ہوتے ہی زندہ حیر کو سواروں کی ایک ٹولی ملی اور اسے معلوم ہوا کہ  
سوار اور اس کا کوئی سپاہی رات بھر نہیں سویا۔ لوگ اسے دیکھتے ہی زندہ حیر آگیا اور جیسے  
آگیا! کہتے ہوئے رام داس کے گھر کی طرف بھاگے۔ زندہ حیر کو پہلی دفعہ اپنے باپ  
کی پریشانی کا خیال آیا اور اس نے گھوڑا تیز کر دیا۔

رام داس اور ارجن مکان سے باہر ایک چھوٹے پڑیٹھے اس کا انتظار کر رہے  
تھے۔ زندہ حیر نے جلدی سے اتر کر گھوڑا ایک سپاہی کے حوالے کیا اور بھاگ کر پہلے  
رام داس اور پھر ارجن کو پر نام کیا۔

”یٹا اقم نے میں بہت پریشانی کیا۔ کہاں تھے تم آرام داس نے یہ کہتے ہو  
زندھیر کو گلے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے تھے۔  
”پتا جی امیں..... میں شہر سے دور چلا گیا تھا۔ بارش میں ایک جگہ ٹھہر  
گیا وہ اپنی پراندھیر سے میں راستہ بھول گیا۔“

رام داس نے کہا ”جاؤ! بیٹا لباس تبدیل کرو تب تک بھی لگت رہی ہوگی۔  
دوپہر کے وقت زندھیر نے گہری نیند سے بیدار ہو کر آنکھیں کھولیں موبہنی  
اس کے سر پر نے کھڑی مسکراہٹ تھی وہ انگڑائی لے کر اٹھا۔

موبہنی بولی ”میں تیسری دفعہ آتی ہوں اور اب تمہیں بڑی مشکل سے جگایا ہے  
کہاں تھے ساری رات! میرے پتا جی تمہارے پتا جی کے ساتھ تمہیں ساری رات  
تلاش کرتے رہے اور ماما جی بھی ساری رات روتی رہیں۔“

زندھیر نے کہا ”موبہنی! تم سے چھوٹ نہیں بول سکتا میں جھیل پر گیا تھا۔  
”سازنی رات.....“  
”نہیں۔ شانتا کو سانپ نے کاٹ لیا تھا۔“  
”سانپ نے؟“

”ہاں!“

”اٹ بے چاری اب کیسی ہے؟“

”اب شاید بچ جائے۔ میں یہاں سے آٹھ نوکوس کے فاصلے پر دریا پار سے  
ایک سپیرے کو لپٹے چلا گیا تھا۔“

”ایسے طوفان میں دریا کے پار کیسے پہنچے؟“

زندھیر نے اس سوال کے جواب میں اپنے سفر کے تمام واقعات سنانے کے  
بعد موبہنی سے پوچھا ”موبہنی! شانتا کو دیکھتے چلو گی؟“

”ایک“

”ابھی، تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔“

”اول تو اس وقت راستے میں کوئی ملے گا  
نہیں اور اگر کوئی ملا تو کہہ دینا کہ مندر کی طرف جا رہی ہوں۔“

”.....“

”.....“

”.....“

”.....“

”.....“

”.....“

”.....“

”.....“

”.....“

”.....“

”.....“

”.....“

”.....“

”.....“

”.....“

ایک پہر رات گئے جب رندھیر کی تلاش شروع ہوئی تو وہ کنول کی جھونپڑی کی طرف بھاگا۔ اس کو پھر باپوسی ہوئی لیکن تھوڑی دیر جھونپڑی کے دروازے کے ساتھ لگ کر کنول بدھوا اور مادھو کی باتیں سننے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ لوگ رندھیر کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ رام داس کو اپنے ساتھ لانے کے لیے پھر شہر کی طرف بھاگا لیکن وہ سپاہیوں کو ساتھ لے کر رندھیر کی تلاش میں جا چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے اُسے تھکاوٹ محسوس ہوئی لیکن فرض شناسی نے اسے جلد ہی تازہ دم کر دیا۔ اس نے زیادہ دیر رام داس کا انتظار نہ کیا اور پھر جھونپڑی کی طرف بھاگا۔ اس نے جھونپڑی کے اندر رندھیر کی آواز دور سے پہچان لی۔ رندھیر کہہ رہا تھا اچھا اب میں جاتا ہوں۔ شکر کے سینے میں جیسے کسی نے شیشہ جھوڑ دیا ہو لیکن اس کے ساتھ ہی جب اس نے یہ کہنا کر صبح ضرور آؤں گا۔ شکر کو گویا دھتے وقت تنکوں کا سہارا مل گیا۔ وہ مطمئن ہو کر رندھیر پہنچا اور چار پائی پر بیٹھے ہی سو گیا۔

دو پہر کے وقت جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ گویا پانی کا گھڑا اس کے اوپر اندیل ہوا ہے اور پروہت لال لال آنکھیں نکال کر یہ کہہ رہا ہے کہ "اس بے وقوف کو اگر بھوک اور پیاس نہ لگے تو اٹھوں پہر سو رہا ہے۔ نہ پوچھا نہ پوچھا گویا یہ کبھی نہاتا بھی ہے یا نہیں؟"

گویا نے جواب دیا ہمارا ج! میں ہی کبھی کبھی اس طرح سوئے ہوتے پر پانی ڈال دیا کرتا ہوں۔

رات بھر کیا کرتا ہے یہ؟

کچھ نہیں ہمارا ج! یہ شام کو کھانا کھاتے ہی سو گیا تھا۔

پروہت شکر کو برا بھلا کہتا ہوا شہر کی طرف چل دیا اور شکر گویا کو چند گالیاں دینے کے بعد چھیل کی طرف بھاگا۔ وہ بار بار اپنے دل میں یہ کہہ رہا تھا "وہ"

اب وہاں سے ہو کر واپس بھی چلا گیا ہوگا۔ میں کیوں سو رہا، مجھے نیند کیوں آتی؟

جھونپڑی کے باہر کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد اس کے کانوں نے گواہی دی کہ رندھیر یہاں نہیں وہ انتہائی مایوسی کی حالت میں وہاں سے لوٹا لیکن زیادہ دیر نہیں گیا تھا کہ اس کا دل خوشی کے سندر میں غوطے کھانے لگا۔ رندھیر اور موہنی آپسے تھے۔ وہ ایک درخت کے نیچے چھپ گیا۔ رندھیر اور موہنی باتیں کرتے ہوئے گزر گئے۔ اس کی نگاہیں جھونپڑی تک ان کا تعاقب کرتی رہیں۔ رندھیر کے ساتھ موہنی کو بھی جھونپڑی میں داخل ہوتے دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ دبے پاؤں چلنا ہوا جھونپڑی کے قریب پہنچا۔ اندر سے موہنی کی آواز آئی۔

شانتا بہن! اب کیسی ہو؟ شکر پر سنبھلے ہی سر پر پاؤں رکھ کر شہر کی طرف بھاگا۔ کاش دیوتا اسے تھوڑی دیر کے لیے اُٹنے کی طاقت عطا کر دیتے۔

شہر کے قریب اسے پروہت ملا اور چند باتیں سننے کے بعد وہ بھی اس کے ساتھ بھاگنے لگا۔

## مادھو کی دیوی

کنول نے ایک مدت کے بعد موہنی کو دیکھا تھا اس لیے پہچان نہ سکی۔ بد  
نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اس لیے مرعوب ہو کر رہ گیا۔ مادھو، موہنی کہہ کر اٹھا اور  
کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ موہنی کا اس کی جھونپڑی میں آنا  
اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھا جب موہنی، شاننا سے باتیں کرنے لگی تو مادھو کی  
بدحواسی مسرت میں تبدیل ہونے لگی۔ اس نے چار پائی گھسیٹ کر آگے کرتے ہوئے  
کہا: موہنی دیوی! بیٹھ جاؤ۔ موہنی مادھو کی درخواست سے زیادہ رندھیر کا اشارہ  
پاکر شاننا کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔

کنول نے رندھیر سے کہا: بیٹا! تم بھی بیٹھ جاؤ۔ رندھیر موہنی سے ذرا ایک  
طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

کنول نے پوچھا: بیٹا! یہ تمہاری بہن ہے؟

اس نے جواب دیا: جی نہیں! یہ موہنی دیوی ہے۔ اس کا باپ ارجن ہے  
ایک دفعہ جب شکر نے مادھو کو مارا تھا یہ میرے ساتھ تھی۔

”ہاں! مجھے یاد آگیا۔ یہ اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ اس نے مادھو کے سر  
پر اپنا دمپرٹ باندھ دیا تھا بہت اچھی لڑکی ہے کیسی ہو بیٹا؟“

موہنی نے جواب دیا: ”اچھی ہوں۔ شاننا اب تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔“  
سپیرا جو اب تک خاموش بیٹھا تھا بول اٹھا: ”ٹھیک کیوں نہ ہوتی میں نے

یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔“

رندھیر نے کہا: ”آپ نے بہت دیا کی۔“

کنول بولی: ”اب یہ جانا چاہتے ہیں۔ میں نے بہت منت کی ہے کہ ایک  
دن ٹھہر جائے!“

رندھیر نے سپیرے سے کہا: ”آپ ایک دو دن ٹھہر جائیں تو کیا ہرج ہے؟“  
سپیرے نے جواب دیا: ”اب میرا یہاں کوئی کام نہیں۔ ادھر کوئی مجھے لینے  
آیا تو اسے بہت پریشانی ہوگی۔ آج بارش نہیں، ممکن ہے کہ کل بارش آجائے۔ پھر  
مجھے بہت تکلیف ہوگی۔“

رندھیر نے کہا: ”میں کل نہیں گھوڑے پر چھوڑاؤں گا۔“

اس نے جواب دیا: ”نہ سرکار! میرا جسم لوہے کا نہیں۔ بدھو نے مجھے گدھے  
پر چھوڑ آنے کا وعدہ کیا ہے۔ میں اس کے ساتھ آہستہ آہستہ چلا جاؤں گا۔“

رندھیر نے پوچھا: ”تو آپ آج ہی جانا چاہتے ہیں؟“

سپیرے نے جواب دیا: ”میرا آج ہی جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہاں  
سے لڑکی کے لیے ایک دوائی بھیجنی ہے۔ وہ دوائی اب میرے پاس نہیں ہے۔  
یہ اس کا ایک بہانہ تھا۔ دراصل وہ گاؤں میں پہنچ کر لوگوں کو سونے کی انگلی  
دکھانے کے لیے بے وقت رہا تھا۔“

رندھیر نے کہا اگر وہ دوائی ضروری ہے تو میں آپ کے ساتھ گھوڑے پر  
جا کر جلدی لے آؤں؟“

سپیرے نے جواب دیا: ”نہیں! آپ کی ضرورت نہیں۔ کل تک بدھو  
جائے گا۔ اس وقت تک جو دوائی میں سے چلا ہوں، کافی ہے۔“

بدھو غور سے موہنی کو بار بار دیکھ کر یہ محسوس کر رہا تھا کہ مادھو نے ایک بہت

رٹا راز اُن سے ابھی تک چھپا رکھا تھا۔ مادھو کی تراشی ہوئی مورتیاں اس لڑکی سے مشابہ تھیں اور مادھو نے گزشتہ شام کنول سے یہ خبر سنتے ہی کہ شہر کا ایک شمع فروش جوان سپیرے کو بلانے کے لیے گیا ہے۔ انہیں جھونپڑی کے ایک کونے میں ایک چادر کے نیچے چھپا دیا تھا۔

شان کو سپیرے نے چلتے پھرنے سے منع کر دیا تھا اس لیے وہ کپڑوں کی ایک گٹھڑی سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ رندھیر کی نگاہیں جھونپڑی کے ٹولے عرض میں بار بار پھر لگانے کے بعد شان کے چہرے پر رک جاتیں لیکن موہنی کی آنکھوں کا کوئی معنی خیز اشارہ اسے پریشان کر دیتا اور وہ مادھو، بدھو یا کنول کی طرف دیکھ کر کوئی بات چھیڑ دیتا۔ مادھو اپنے گرد و پیش سے بے خبر موہنی کی طرف ٹٹکنکی باندھ کر دیکھ رہا تھا اور وہ اپنے گالوں پر ایک خوش گو اور حرات محسوس کر رہی تھی۔ بدھو، مادھو کی اس محویت کو دیکھ چکا تھا جو اس پر پتھر کی خوبصورت مورتیاں دیکھ کر طاری ہو جایا کرتی تھی اور اس کے دل میں مادھو کی وہ ماحولی حالت کے متعلق کئی شبہات پیدا ہو چکے تھے لیکن آج موہنی کی طرف دیکھ کر اسے علم ہوا کہ مادھو کی تراشی ہوئی بے جان مورتیاں اس پیکر حسن و جمال کی غیر فانی تصویریں تھیں وہ دھبہ راکھ جو اس نے صبح شام ان مورتیوں کے سامنے گائے تھے دراصل اس لڑکی کے لیے تھے۔ اور وہ تو تازہ پھول جنہیں وہ ہر صبح لاکر ان مورتیوں پر بچھا کر کرتا تھا ایک اونچی ذات کی دیوی کے قدموں میں ایک نیچ ذات کی ادنیٰ بھینٹ تھی۔ بدھو کے دل میں مادھو کے لیے رحم اور موہنی کے لیے شفقت کے جذبات کروٹیں لینے لگے۔ وہ تصور میں اپنی لاٹلی بہو کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ اونچی ذات کی ایک باوقار لڑکی کا اس جھونپڑی میں آنا ہی اس بات کا کافی ثبوت تھا کہ وہ مادھو کی محبت سے غافل نہیں۔

رندھیر اور شان کی محبت کے متعلق بھی اب اسے کوئی شبہ نہ تھا لیکن کی زبان پر اگرچہ گنگ تھیں لیکن نگاہوں میں کافی بے باکی آچکی تھی۔ مادھو کی بے قرار نگاہیں بھی اس کے دل کی ترجمانی کر رہی تھیں لیکن موہنی کی حیا کے باعث ان کے درمیان اجنبیت کے پورے ڈاکٹھ کے موہنی اور شان دونوں کے دل ایک ہی جیسے سیلاب سے آشنا تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ شان اپنے مستقبل سے بے پروا ہو کر اس سیلاب کو بہنے اور بہانے جانے کی اجازت دے چکی تھی لیکن موہنی اپنے انجام سے خوفزدہ ہو کر اسے پتھریاں دے کر اپنے دل میں سُلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس سیلاب کے سامنے آخری چٹان رندھیر ہو سکتا تھا۔ رندھیر کا سہارا لے کر وہ اپنے دل کو مادھو کی نگاہوں کے سامنے پتھر بنا سکتی تھی۔ لیکن اب یہ سہارا ٹوٹنے کے متعلق اسے کوئی شبہ نہ رہا۔ پہلی دفعہ اس نے رندھیر اور شان کی نگاہوں کے اشاروں سے متاثر ہونے کے بعد اپنے دل کو یہ کہہ کر دھوکا دینے کی کوشش کی تھی کہ اچھوت لڑکی کے ساتھ رندھیر کی دلچسپی عارضی اور بھگامی ہے۔ آج گھر پر دوپہر کے وقت جب اس نے اپنی تازہ سرگزشت سنائی تو اس کے شبہات میں کچھ اضافہ ہو گیا۔ مادھو گزشتہ ملاقات میں اس کے دل پر ایک زلزلے والا نقش چھوڑ چکا تھا اسے جب بھی اس کا خیال آتا وہ پریشان ہو جاتی۔ بھگوان سے اپنے دھرم پر اور رندھیر کی محبت میں ثابت قدم رہنے کی دعائیں کرتی۔ وہ اپنے دل میں بہہ رہی تھی کہ وہ مادھو کو دوبارہ نہ دیکھے گی لیکن آج اسے رندھیر کے متعلق بڑھتے ہوئے شبہات نے یہ عہد توڑنے پر مجبور کر دیا اور وہ شان سے سہارے کے بہانے اس جھونپڑی میں چلی آئی۔

کیا کہ وہ اس نے بہت دور جا رہا ہے اور مادھو کی نگاہیں اس کے دل کے وہ دورائے کوڑی میں جہاں وہ زندھیر کا پہرا بٹھانا چاہتی تھی تاہم اسے زندھیر سے اس قدر گلہ نہ تھا جس قدر مادھو سے خوف تھا اس نے ایک دوسرے آنکھ بچا کر مادھو کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ اگر وہ زیادہ دیر یہاں ٹھہری تو محبت کے اس دیوتا کے سامنے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس نے گہرا کر کہا:-  
”زندھیر! چلو گھر چلیں۔“

زندھیر نے چونکہ مومنی اور اس کے بعد شانتا کی طرف دیکھا۔ شانتا کی نگاہیں اس کے پاؤں کے نیچے زنجیریں گئیں۔

اس کا تذبذب دیکھ کر مومنی پھر بولی ”اچھا زندھیر! تم بیٹھو میں چلتی ہوں۔“  
بڑھونے آگے بڑھ کر کہا۔ ”بیٹھو بیٹی! تم پہلے دن ہمارے گھر میں آئی ہو۔“  
زندھیر نے بڑھو کی تائید کی ”ہاں ہاں مومنی! تھوڑی دیر بیٹھو، ابھی چلتے ہیں ہاں مجھے ایک بات یاد آگئی۔ شانتا تم کہتی تھیں۔ مادھو نے اپنی دیوی کی موت یا بنائی ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟“

شانتا نے قدرے خوف زدہ ہو کر بڑھو اور مادھو کی طرف دیکھا۔ مادھو کو کچھ دیر اور مومنی کو بٹھانے کی تدبیر نظر آئی۔ لیکن وہ کچھ سوچنے کے بعد فکر مند ہو کر زندھیر کی طرف دیکھنے لگا۔

زندھیر نے کہا: ”دکھاؤ ایر برا نہیں مانیں گی۔ انہیں مورتیاں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ کیوں مومنی! دیکھو گی نا؟ شانتا ان مورتیوں کی بہت تعریف کرتی تھی۔“  
مومنی نے نڈھال ہو کر زندھیر کی طرف دیکھا اور مادھو نے اس کی خاموشی کو رونا مندی سمجھتے ہوئے جھونپڑی کے کونے میں جا کر مورتیوں کے اوپر سے جلاوڑ اٹھا دی۔ تین مورتیاں ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ ان میں سے دو کی مومنی کے ساتھ

گہری مشابہت تھی اور درمیان والی مورتی مومنی کی مکمل تصویر تھی۔ مورتیوں کے قدموں میں تازہ پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ مومنی پر تھوڑی دیر کے لیے ایک سگے کا عالم طاری ہو گیا۔ سنگ تراشی میں مادھو کا یہ کمال زندھیر کی توقع سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ وہ یکے بعد دیگرے مومنی اور مورتیوں کی طرف دیکھتا ہوا چار پائی سے اٹھا اور مورتیوں کے سامنے آکھڑا ہوا۔

اس نے کہا ”مومنی! اگر ان مورتیوں کے ساتھ آئینہ رکھ کر اپنی شکل دیکھو تو مجھے یقین ہے کہ اپنے عکس اور اس مورتی کے درمیان کوئی فرق نہ پاؤ گی۔ مادھو! تم نے سچ مچ کمال کر دکھایا۔“

سپیرا بھی کسٹک کر مورتیوں کے قریب آ بیٹھا۔ اس نے کہا ”ان مورتیوں میں صرف جان کی کمی ہے ورنہ شکل تو ہو بہو اس دیوی کی ہے۔“

مومنی کو جیسے کسی نے ہاتھ پاؤں باندھ کر دریا میں پھینک دیا ہو وہ تھوڑی دیر میں حواس درست کرنے کے بعد چار پائی سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بھاگنے کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے آفسوڈل کے پر سے چھانگنے اور ایک درخت کے ساتھ سر لگا کر سسکیاں لینے لگی لیکن اس کا ضمیر کہ رہا تھا۔ مومنی! اس بچائے کا کوئی قصور نہیں تمہیں اس کی محبت کا علم تھا اس کی یہ جرات تمہاری حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے۔ آخر تو بار بار یہاں کیوں آئی؟ تو ایک دلت سے اس کی طرف کچھنجی جا رہی تھی۔ مادھو کے ساتھ تیری دلچسپی صرف ہمدردی کی وجہ سے نہ تھی بلکہ تجھے اس کے ساتھ پریم تھا تو اس پریم پر فتح حاصل کر کے لیے زندھیر کی پناہ لینے چاہتی تھی لیکن تو جانتی ہے کہ زندھیر کے ساتھ شادی کر کے بھی تیرے دل میں یہ آگ سلگتی رہے گی جسے تو دھرم رکھنا سمجھتی ہے وہ دراصل سماج کے انتقام کا خوف ہے۔ مومنی تو بزدل ہے اور موت سے پہلے پنا

بلیدان سے رہی ہے تو مادھو سے بھاگ کر سماج کی پناہ لے سکتی ہے لیکن تیری  
روح پر ہمیشہ اس کا قبضہ ہے گا۔ اس نے بے بسی کی حالت میں آسمان کی طرف دیکھا  
اور کہا:  
”بھگوان! تو نے اسے شہور کیوں بنایا اور اگر اسے شہور بنایا تھا تو مجھے  
اونچی ذات میں پیدا کیوں کیا؟“

(۳)

موہنی کے جھوپڑی سے نکلنے کے بعد تمام لوگ پریشان ہو کر ایک دوسرے  
کی طرف دیکھنے لگے وہ خیالی جنت جو مادھو نے برسوں میں آباد کی تھی آنا نانا اُجڑ  
گئی۔ وہ انتہائی رنج و کرب کی حالت میں رندھیر کے پاؤں پر گر پڑا اور گڑ گڑا کر  
کہنے لگا وہ مجھ سے خفا ہو گئیں۔ وہ مجھ سے روٹھ گئیں۔ مجھے معلوم نہ تھا وہ بڑا  
مانیں گی میں بے قصور ہوں۔ آپ جانتے ہیں میں بے قصور ہوں۔  
رندھیر نے مادھو کا بازو پکڑ کر اٹھایا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ مادھو! وہ  
تم سے خفا نہیں۔ میری بات پر عین کرو۔ میں پھر آؤں گا۔  
رندھیر بھاگتا ہوا موہنی کے قریب پہنچا اس نے پوچھا: موہنی! کیا ہو گیا ہے؟  
موہنی نے آنسو پونچھ کر ایک مخموم مسکراہٹ کے ساتھ رندھیر کی طرف دیکھا  
اور جواب دیا۔ کچھ نہیں رندھیر! سچ بتاؤ تم مجھ سے نفرت تو نہیں کرتے؟  
”نفرت! اور تم سے! وہ کیوں؟“  
رندھیر تم جانتے ہو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں یہاں آنا بھی نہیں چاہتی  
تھی۔ میں نے کبھی اس کے ساتھ بات بھی نہیں کی۔

موہنی! وہ تم سے پریم کرتا ہے فہمی پریم جو انسان دیوتاؤں سے کرتے ہیں  
بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا پریم دیوتاؤں سے بھی بہت کم انسان کرتے ہوں گے  
میں ذاتی طور پر پریم کے معاملے میں اونچے اور نیچے کا قائل نہیں رہا۔ موہنی! تم نے  
شاننا کو دیکھا اس نے کل میرے لیے اپنی جان تک قربان کر دینا ایک کھیل سمجھا  
سماج کا قانون مجھے اس سے نفرت سکھاتا ہے لیکن انسانیت مجھے اس کی  
محبت کا جواب دینے سے منع نہیں کر سکتی میں اس کا دل توڑنا ایک پاپ سمجھتا ہوں  
اور اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کسی صورت میں بھی مادھو جیسے نوجوان سے نفرت  
نہ کر سکتا۔ اس نے تمہاری مورتیاں بنا کر کوئی پاپ نہیں کیا۔ موہنی! سچ کہو تمہیں اس  
سے پریم نہیں؟“

موہنی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ رندھیر! مجھ سے یہ نہ پوچھو میں ایک  
عورت ہوں جو اپنی حد سے باہر پاؤں نہیں رکھ سکتی۔  
”موہنی! میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں اس سے  
پریم ہے یا نہیں؟“

مجھے معلوم نہیں۔ پریم کیا ہوتا ہے؟ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اسے قبول  
جانا اب میرے بس کی بات نہیں لیکن میں آگ کے ساتھ نہیں کھیلوں گی میں بدنامی  
اور رسوائی کی زندگی پر موت کو ترجیح دوں گی۔ ماں باپ کا نام رسوا کرنے کی بجائے  
اپنا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ ڈالوں گی۔

موہنی پھر ہچکیاں لینے لگی۔ رندھیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے  
تسلی دیتے ہوئے کہا: موہنی! میں جانتا ہوں کہ تمہارے راستے میں نہایت خطرناک  
چٹانیں ہیں لیکن دنیا میں کوئی مشکل ایسی نہیں جس پر ہمت اور استقلال سے فتح حاصل  
نہ کی جاسکے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

موتی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اچانک جھڑپوں میں سے سرسراہٹ کی آواز آئی اور رام داس شاباش بیٹا شاباش!! کہتا ہوا نمودار ہوا۔ رام داس کے پیچھے ارجن کو دیکھ کر موتی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑی۔ رندھیر نے اسے آگے بڑھ کر اٹھانا چاہا لیکن ارجن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پیچھے دھکیل دیا اور کہا: بد معاش! ہٹو پیچھے! مرنے دو اسے!

رام داس نے جھک کر موتی کو اٹھایا اور ارجن کی طرف دیکھ کر کہا: ارجن موتی نروش ہے یہ سب قصور رندھیر کا ہے۔ اس کا اپنا منہ کالا ہو چکا ہے اور یہ موتی کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتا ہے۔

موتی نے ہوش میں آ کر انکھیں کھولیں اور خوف زدہ ہو کر اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔ اتنے میں شنکر اور پروہت بھی جھڑپوں سے باہر آچکے تھے۔ رام داس نے موتی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”بیٹی! ہم سب باتیں سن چکے ہیں تم بے قصور ہو۔ جاؤ اپنے گھر! شنکر تم اس کے ساتھ جاؤ لیکن اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا اور پروہت جی! اب ہماری عمر آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

پروہت نے جواب دیا: آپ نکرہ کریں کسی کو اس بات کا علم نہ ہوگا۔  
موتی شنکر کے ساتھ چل دی۔

رام داس رندھیر سے مخاطب ہوا: تو کل تم راستہ بھول گئے تھے تمہیں اس بات کی بھی شرم نہ آئی کہ تمہارا باپ شہر کا سردار ہے۔ تم موتی سے کس بات کا انتقام لینا چاہتے تھے اور ارجن تم بھی چلو میں تمہارے سامنے بہت ناموس ہوں۔ اب مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا کروں گا۔ موتی کی عمر ہی کیا ہے اسے یہ باتیں کیا معلوم! یہ ساری بدی رندھیر کی ہے۔ کل تک سارے معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔ چلو اب گھر چلیں۔“

(۴)

راستے میں رندھیر نے کئی بار رام داس سے کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن اس کے تیور دیکھ کر اسے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ شنکر ان کے پہنچنے سے پہلے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا اس نے کہا: ہمارا جی! موتی دیوی کو گھر چھوڑ آیا ہوں، کوئی اور حکم ہے؟ کچھ نہیں مقرر جاؤ۔ رام داس نے تدریسے تلخ ہو کر جواب دیا۔

”پتا جی! رندھیر نے فرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔

رام داس نے اس پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی اور غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا: ”میں تمہاری کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔“

پتا جی!..... پتا جی! وہ نروش ہیں۔ وہ شود بھی نہیں میں ان پر ظلم نہیں ہونے دوں گا۔“

رام داس کا پیمانہ ٹھہر رہا تھا وہ دانت پستیا ہوا آگے بڑھا اور رندھیر کے منہ پر پوری طاقت سے تھپڑ رسید کرنے کے بعد اس کے سر کے بال پکڑ کر جھکاتا ہوا مکان کے اندر لے گیا۔ رندھیر کا ضبط اور سکون اسے متاثر نہ کر سکا۔ اور وہ پھر ایک بار اسے پٹینے لگا۔ رندھیر ایک دیوار کی طرح کھڑا یہ سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ رام داس کے ہاتھ تھک گئے اور رندھیر کے ہونٹوں سے خونی ٹپکنے لگا۔ رندھیر کے سفید گالوں پر انگلیوں کے نشان اور ہونٹوں پر خون کے قطرے دیکھ کر پروہت شفقت نے رام داس کے ہاتھ پکڑ لیے اور وہ کہنے لگا:

”ہاں تمہاری نظروں میں وہ شود نہیں۔ تم انہیں برہمن سمجھتے ہو اور تم ان پر ظلم نہیں ہونے دو گے۔ بے شرم! بے حیا! اکیلتہ کہیں گا۔“

رندھیر نے کہا: پتا جی! میں سچ کہتا ہوں، وہ.....!“

”چپ رہو! رام داس کی گرجتی ہوئی آواز نے رندھیر کے ہونٹ ہی دیے۔  
 رام داس نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا:  
 ”چلو میرے ساتھ! رندھیر بے بس سا ہو کر اس کے ساتھ چل دیا۔ رام داس  
 نے مکان کی ایک کونٹھڑی کے دروازے پر پہنچ کر اسے اندر دھکیل دیا اور باہر سے  
 کنڈی لگاتے ہوئے کہا:

”تم اب یہاں رہو۔“

رندھیر نے دروازے کو اندر سے دھکے دیتے ہوئے کہا:  
 ”پتا جی! پتا جی! امیری بات سنئے۔ پتا جی! بھگوان کے لیے وہ شہور  
 نہیں۔ وہ آپ کے دوست سکھ دیو کی اولاد ہیں۔  
 لیکن رام داس جا چکا تھا۔ پتھر کے فرش پر اس کے والیں لڑختے ہوئے  
 قدموں کی آہٹ بتدیج کم ہو رہی تھی۔“

## سماج کی فتنہ

بدھو سپیرے کے ساتھ جا چکا تھا۔ پڑوس کا ایک چروایا ان کی بھیڑ میں چرائے  
 کے لیے لے گیا۔ مادھو کو باقی دن گھر میں بیٹھ کر گزارنا مشکل نظر آیا وہ مورتیاں جن میں  
 دیکھتے ہی اس پر ایک محویت سی طاری ہو جایا کرتی تھی اب اسے پتھر کے بے حس  
 مکڑے نظر آ رہے تھے۔ مومنی کے خفا ہو کر بھاگنے کی صحیح وجہ اس کی سمجھ میں نہ آ  
 سکی وہ صرف یہ سوچ سکتا تھا کہ مورتی صرف ان مورتیوں کو دیکھ کر خفا ہو گئی ہے اسے  
 بار بار یہ خیال آتا تھا کیا یہ ممکن ہے کہ اونچی ذات کے انسانوں کی مورتیاں بنانا پاپ  
 خیال کرتے ہوں؟ نہیں! یہ ممکن نہیں!! آخر رندھیر بھی تو ایک اونچی ذات کا آدمی ہے  
 اگر اس میں کوئی برائی ہوتی تو وہ یقیناً ان مورتیوں کو دیکھ کر خوش نہ ہوتا۔ بہر حال مومنی یہاں  
 سے خوش ہو کر نہیں گئی۔ کاش! میں یہ مورتیاں نہ بناتا۔ لیکن اب کیا ہو گا؟ میں شاید بار  
 اسے دیکھ سکوں۔

مستقبل کی بے کیف اور غمگین زندگی کے تصور سے وہ کانپ اٹھا۔ انتہائی  
 مایوسی اور بے بسی میں اسے امید کی ایک ہلکی سی کرن نظر آئی اور اس نے محسوس کیا  
 کہ وہ اب صرف بھگوان یا اس زبردست طاقت کا سہارا لے سکتا ہے جس نے  
 اسے اور مومنی کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے بار بار غیر متوقع حالات  
 پیدا کئے تھے۔ وہ طاقت جو مومنی کو دھکیلتی ہوئی اس کی جھونپڑی میں لے آئی تھی  
 اور آج اُس سے مومنی خفا نہیں ہوئی بلکہ بھگوان خفا ہو گیا ہے۔ لیکن کیوں؟ شاید

اس لیے کہ اس نے موتی کی موتیاں بنانے کے مشوق میں بھگوان کو بھلا دیا تھا اس لئے بھگوان کی زبردست طاقت کا سہارا لینے کی بجائے ان موتیوں کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنالیا تھا وہ بے قرار ہو کر اٹھا کنول اور شاننا سے کچھ کہے بغیر جھوپڑی سے باہر نکل آیا۔ ہر قدم پر اس کے دل سے یہ پکارا اٹھ رہی تھی "بھگوان میری خطا معاف کر لے زمین و آسمان کی زبردست طاقت! میری خطا معاف کر!"

مادھو جھیل کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور دیر تک سر جھکا بھگوان کو مخاطب کرنے کے لیے موزون الفاظ سوچتا رہا۔ اچانک اسے موتی کا سکھا یا ہوا بھجن یاد آیا اور وہ درد بھری آواز میں لگناتے لگا۔ "ہستہ! ہستہ! و گرویش سے بے خبر ہوتا گیا اور اس کی نئے بلند ہوتی گئی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی روح نیلگوں آسمان کی وسعتوں کو عبور کرتی ہوئی ان بلندیوں تک پہنچ رہی ہے جہاں بھگوان رہتا ہے لیکن اچانک ایک پتھر اس کی کمر میں آگیا۔ اس نے پریشان ہو کر آنکھیں کھولیں اور دھونچکا ہو کر رہ گیا۔ آٹھ آدمی لاکھوں اور کلہاڑیوں سے مسلح اس کے ارد گرد کھڑے اسے خوبخوار آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

شکر نے کہا "مادھو! اسے ساتھ چلو۔"

مادھو کو اس نئی مصیبت میں بھی بھگوان کی مرضی نظر آئی وہ اٹھا اور بے خوف اس ان کے آگے آگے چل دیا۔

پھر چند قدم چلنے کے بعد پیچھے سے کسی کی آواز آئی "بھیرو! یہ بہت بھاری ہیں سب کو باری باری اٹھانی پڑیں گی۔"

مادھو نے پیچھے مڑ کر دیکھا تین آدمی مادھو کی تراشی ہوئی موتیاں اٹھاتے آہستہ آہستہ آگے تھے۔

مادھو کو کنول اور شاننا کا خیال آیا اور اس نے مڑا ہوا التجا بن کر شکر کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا: "یہ موتیاں میں نے بنائی ہیں۔ میری ماں اور بہن کا اس میں کوئی قصور نہیں۔"

شکر نے غضب ناک ہو کر کہا "شور مکنے! تو نے یہ بنائی ہیں یا بیمار مندروں سے چوری کی ہیں؟"

"نہیں! میں نے چوری نہیں کی۔"

شکر پہلے ہی ایک اچھوت کو دیکھنے اور اس کے ساتھ باتیں کرنے میں اپنے دھرم کا کچھ حصہ بھروسہ کر چکا تھا۔ اس نے لال پیلا ہو کر کہا:

"چپ رہو ورنہ زبان کاٹ ڈالوں گا لے چلو اسے!"

لاکھوں اور کلہاڑیوں کو شکر کے حکم کی تعمیل کے لیے مستعد پا کر مادھو پھر اپنے پہرہ داروں کے ساتھ چل دیا۔

(۲)

شام سے کچھ دیر پہلے رام داس کے گھر کے نزدیک پیل کے ایک درخت کے نیچے ایک چبوترے کے ارد گرد شکر کے مردوں اور عورتوں کا ہجوم تھا چبوترے پر تین موتیاں رکھی ہوئی تھیں اور لوگ ان کے سامنے روپیہ، پیسہ، پھل پھول اور غلے کے ڈھیر لگا رہے تھے۔

شکر کے شمال میں کچھ دور آج بدلتوں کے بعد کالی دیوی کے مندر میں کچھ رونے والی تھیں۔ لوگ ان موتیوں کے سامنے ہدیہ عقیدت پیش کرنے کے بعد اس مندر کا رخ کر رہے تھے۔ رام داس کی سرداری کے زمانے میں کالی دیوی کے پجاری ضرر مولشیوں کے دان پر اکتفا کرتے رہے لیکن آج ان کے لیے ایک انتہائی مر

کا دل تھا۔

رام داس مندروں کے چور کے لیے کوئی اور سزا تجویز کرنا چاہتا تھا لیکن جہت شہر کے برہمنوں اور ارجن کے سامنے اس کی پیش نہ کی گئی۔ مادھو کو شہر کے آٹھ قابل اعتماد آدمیوں نے اپنے کانوں سے مقدس زبان میں بھجن گاتے سنا تھا۔ تین مورتیاں جن کے متعلق شہر کے برہمنوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ وہ دور دراز کے مندروں سے چرائی گئی ہیں اس کے گھر سے دست یاب ہو چکی تھیں اتنے بڑے مجرم کی سزا کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی سوچ بچار کی ضرورت نہ تھی۔

رام داس اگر سردار کی بجائے ایک راجہ بھی ہوتا تو بھی اسے پرمہت کی مرضی کے سامنے تسلیم خیم کرنا پڑتا۔ وہ بدنامی سے بچنے کے لیے مادھو کو گرفتار کر کے جلاوطن کرنا چاہتا تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ وہ بھجن گاتا ہوا پکڑا جائے گا اور اس کے گھر سے مورتیاں برآمد ہوں گی۔ وہ اپنی رواداری کے باعث اونچی ذات کے لوگوں کی نظر میں بہت بدنام تھا لیکن یہ واقعہ ایسا نہ تھا کہ وہ رائے عامہ کے احترام سے بے پروا ہو کر کوئی فیصلہ کرنا نہ ہندوؤں کی مقدس مورتیاں چرانے اور چھپ چھپ کر بھجن سننے کے علاوہ مادھو نے براہ راست اس کی اور اس کے دوست کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اس لیے جب برہمنوں کی بچاوت نے ایک زبان ہو کر کالی دیوی کے مندروں میں مادھو کے بلیدان کا مطالبہ کیا تو اسے اس قدر تکلیف نہ ہوئی جتنی کہ عام حالات میں ہونی چاہیے تھی۔

مادھو کے گھر کے باقی افراد کے متعلق بالخصوص اس کی بہن کے متعلق اسے تشویش تھی اور وہ چاہتا تھا کہ وہ سماج کا ملوفان اٹھنے سے پہلے اپنی جانیں بچا کر کہیں بھاگ جائیں۔ انتہائی غصے کی حالت میں بھی عورتوں پر ہاتھ اٹھانا وہ اپنی سماج کی بہادرانہ روایات کے منافی خیال کرتا تھا۔ شہر کے لوگ کالی دیوی کے مندروں میں

کے بعد بلیدان دیتے جانے کی خبر سُن رہے تھے۔ ان کے لیے اس معاملہ میں ایک لمحہ بھر کی تاخیر بھی صبر آزما تھی۔ وہ رات ہونے سے پہلے ہی اس مقدس فریضے سے سبک دوش ہونا چاہتے تھے لیکن بد قسمتی سے کالی دیوی کے مندر کا پرمہت دیا کے پار ایک گاؤں میں کسی رشتہ دار سے ملنے کے لیے گیا ہوا تھا۔

رام داس نے برہمنوں کے اصرار پر اسے لانے کے لیے شام کے وقت ہی ایک کشتی دیا کے پار بھجوا دی اور انہیں اطمینان دلایا کہ پرمہت سو بج نکلنے سے پہلے پہنچ جائے گا۔

رام داس کو اس بات کا افسوس تھا کہ وہ مادھو کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ تاہم برہمنوں کے فیصلے کے بعد وہ چاہتا تھا کہ یہ بلیدان اب جس قدر جلد ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے ورنہ اتنی دیر نہ دھیر کو کوٹھڑی میں بند رکھنا پڑے گا۔ دندھیر کے متعلق اسے یقین تھا کہ وہ اپنی ہٹ کا پتلا ہے اور مادھو کو بچا کا جواز وہ وہ ظاہر کر چکا ہے اسے ضرور پورا کرے گا۔

(۳۱)

مادھو کی گرفتاری سے قبل جو سپاہی جھونپڑی کی تلاشی لینے گئے تھے انہیں رام داس نے عورتوں پر کسی قسم کی زیادتی کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس لیے کسی نے شائنا اور کنول سے بات تک نہ کی۔ تاہم شکر کے لیے اچھوت کی جھونپڑی میں داخل ہونا اور شائنا جیسی لڑکی سے بات تک نہ کرنا صبر آزما تھا۔ وہ اپنے دل میں اچھا پھر ہی کہہ کر نکلا اور سپاہیوں کے ساتھ مادھو کی تلاش میں چل دیا۔ سپاہیوں کے جاتے ہی کنول کو مادھو کی فکر دامن گیر ہوئی اور وہ تھوڑی دیر

انتظار کرنے کے بعد جھونپڑی سے نکلی اس نے جھیل کے کنارے اور اس پاس کی بستیوں میں کئی چکر لگائے لیکن مادھو کا کہیں پتہ نہ تھا چند شور بھی اس کی بقیہاری دیکھ کر اپنے اپنے گھروں سے نکلے اور مادھو کو تلاش کرنے لگے۔ کنول تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد گھر آئی اور شاننا کو تسلی دے کر پھر مادھو کی تلاش میں نکل جاتی۔

جوں جوں رات قریب آ رہی تھی۔ مادھو کے متعلق اس کا وہم یقین میں تبدیل ہونے لگا کہ اسے شہر کے سپاہی پکڑ کر لے گئے ہیں۔ رات کے وقت ایک چرواہے نے اسے بتایا کہ فلاں بستی کا ایک چرواہا مادھو سے منسوب سیکھا کرتا ہے۔ شاید اس کے پاس گیا ہو گا۔ یہ بستی ایک کوس پر تھی۔ لیکن مایوسی کے دریا میں ڈوبتی ہوئی مانتا نے پھر ایک بار تنکوں کا سہارا لیا اور کنول، شاننا کو تسلیاں دینے کے بعد چرواہے کو ساتھ لے کر اس بستی کی طرف چل پڑی۔

شاننا جھونپڑی سے باہر اپنی چارپائی پر لیٹی ستاروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مادھو کے متعلق کنول کی طرح اس کا بھی یہی خیال تھا کہ اسے شہر کے سپاہی پکڑ کر لے گئے ہیں لیکن وہاں زندہ جیسے رحم دل انسان کی موجودگی کے باعث اسے ایک گہرا یمنان تھا۔

اچانک اس نے اپنے متعلق سوچا۔ اگر کوئی مجھے پکڑ کر لے جائے تو بے اور یہ خیال آتے ہی پاس کے درخت اور جھاریاں اس کے لیے تو بہات کے بھوت بن گئے وہ گھبرا کر اپنے بستر سے اٹھی اور جھونپڑی کے اندر جا کر اپنے پتا کی تلوار نکال لائی اور دوبارہ چارپائی پر لیٹ کر تصور میں اپنے کئی دشمنوں کو خاک و خون میں تر پتا ہوا دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنی اور ماما۔ ماما کہتی ہوئی

اٹھ اٹھی۔

”تہاری ماما گھر میں نہیں؟“ ایک کرخنٹ مردانہ آواز نے شاننا پر لکڑی کر دی۔ اس نے چیخے مڑ کر دیکھا۔ ایک آدمی ہاتھ میں مشعل لیے جھونپڑی کے پاس کھڑا تھا۔

”تم کون ہو؟“ شاننا نے سمجھی ہوئی آواز میں پوچھا۔  
”شور نہ کرو۔“ یہ کہہ کر اس نے مشعل جھونپڑی کی طرف بڑھائی۔ سر کندھے کے تنکوں میں آگ کے شعلے بھڑکے۔ شاننا نے بڑھتی ہوئی روشنی میں شکر کے چہرے کی چمکتی ہوئی سیاہی سے اسے پہچان لیا۔ وہ چارپائی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بھاگنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ شکر نے مشعل پھینکی اور آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔  
”چلو میرے ساتھ۔“

شاننا نے جھٹک کر اپنا بازو چھڑایا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔  
”اچھوت اور یہ خھرے!“

شاننا حسرت بھری نگاہوں سے جھونپڑی کی بڑھتی ہوئی آگ کو دیکھنے لگی۔ شکر نے آگے بڑھ کر پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شاننا نے اس دفعہ دوسرے ہاتھ سے پوری طاقت کے ساتھ اس کے منہ پر چپت رسید کیا۔ اور وہ شاننا کا ہاتھ چھوڑ کر اپنا گال سہلانے لگا۔

”جھگو ان نے تمہارے ہاتھ تھپڑ مارنے کے لیے نہیں۔ چوہے جانے کے لیے بنائے ہیں۔“ یہ کہہ کر شکر پھر آگے بڑھا لیکن شاننا نے بھاگ کر چارپائی پر سے تلوار اٹھالی اور اس کی نوک شکر کے سینے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔  
”جے شرم! بے جیا! کیٹے!! اگر ایک قدم آگے بڑھایا تو تیرے ٹکڑے ٹکڑے ٹکڑے ٹکڑے شکر راسید ہو کر اٹھے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا اور شاننا غضب ناک ہو کر

انگے بڑھنے لگی۔ اٹنے پاؤں تیزی سے چلتے ہوئے شکر کے پاؤں کو ایک پتھر کی ٹھوکری لگی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا جھونپڑی کی جلتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرایا۔ آگ کے شعلوں نے اس کا منہ اور اس کے سر کے بال جھلس دیے۔ شاننا نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور بزدل کہہ کر تلوار نیچے کر لی۔ اس حرص میں بستی کے لوگ شور مچاتے ہوئے جھونپڑی کی طرف آ رہے تھے۔ شکر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور ان کی آن میں درختوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں بہت سے مرد اور عورتیں شاننا کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ جھونپڑی کی آگ بجھانا اب کسی کے بس میں نہ تھا۔ شاننا بار بار کہہ رہی تھی: "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اس قدر بزدل ہے تو میں اسے جھونپڑی کو کبھی آگ نہ لگانے دیتی میں اس کے ہاتھ سے مشعل چھین لیتی؟"

(۴)

تھوڑی دیر بعد کنول پہنچ گئی اور شاننا مانا کہہ کر روتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

کنول نے اسے تسلی دی اور شاننا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "مانا! میرا قصور ہے۔ میں ڈر گئی تھی ورنہ وہ بہت بزدل تھا۔ میں اگر بہت کرتی تو اس کے ہاتھ سے مشعل چھین لیتی۔"

کنول کے ہاتھ سے جھونپڑی کی کوئی اہمیت نہ تھی اس کے ذہن میں صرف مادہ تھا۔ وہ شہر میں اس کا پتہ لگانے کے طریقے سوچ رہی تھی لیکن اسے ڈر تھا کہ کوئی اچھوت شہر جانے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔

اب وہ اپنا آخری حربہ استعمال کرنے پر مجبور تھی اس نے جھونپڑی کے قریب جمع ہونے والے لوگوں سے کہا:

"تم میں سے کسی نے اب تک مجھے نہیں پہچانا لیکن تم میں کسی ایسے بیچ نہیں ہیں پہچانتی ہوں میں تمہارے سردار کی بیٹی ہوں۔ جن لوگوں نے آج سے بیس برس پہلے میرے پتا کو قتل کیا تھا وہ آج میرے بیٹے مادھو کو پکڑ کر لے گئے ہیں اور اس کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو انہوں نے میرے باپ کے ساتھ کیا تھا۔ تم میں سے کون ہے جو میرے بیٹے کی جان بچانے کے لیے میرا ساتھ دے گا؟ لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے "سردار کی بیٹی۔ کون؟۔ کنول! کنول!! کنول!!!"

کنول نے کہا "ہاں! میں کنول ہوں۔ تم سکھو لو کو بھی جانتے ہو وہ میرا بیٹی تھا۔"

چند بوڑھے اور ادھیڑ عمر لوگ کنول کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک سفید ریش آدمی نے آگے بڑھ کر آگ کی روشنی میں کنول کی طرف غور سے دیکھا اور پوچھا "کنول بیٹی! مجھے پہچانتی ہو؟"

میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں جب میں چھوٹی تھی تم مجھے سارا دن کندھوں پر اٹھائے پھر کرتے تھے تمہیں یاد ہے ایک دن تم آم کے درخت کے نیچے رہے تھے۔ تمہارا منہ کھلا تھا اور میں نے تمہارے منہ میں آم لاکر نیچوڑ دیا تھا۔ ایک دفعہ میں نے مٹی کھائی تھی اور تم نے مجھے بہت پیٹا تھا اور پھر پتا جی سے بھی پوچھایا تھا۔ کیوں چچا تیجہ پہچانا مجھے؟"

کنول اور سفید ریش بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ قوم کے باقی لوگوں کو بھی وہ آزادی اور بے فکری کے دن یاد آ گئے سب کی آنکھیں

پروم ہو گئیں۔ کنول نے کہا: چچا! مادھو کا پتہ لگاؤ۔ وہ اس کے لئے تیار ہے۔  
 کنول نے کہا: کنول! تو ہمارے سردار کی بیٹی ہے۔ تیرے اشاروں پر جان  
 قربان کرنا ہمارا دھرم ہے۔ لیکن تو جانتی ہے کہ ہم اپنے دشمن کے مقابلے میں نہیں ہیں  
 ہم میں کوئی اتفاق نہیں۔ تیرے پتا کی موت کے بعد ہم کچھ مدت چھپ چھپ کر  
 لڑتے رہے۔ لیکن نیا سردار رام داس ایک ہوشیار آدمی تھا وہ ایک دن اکیلا ہمارے  
 پاس پہاڑوں میں چلا آیا اور ہم سے انصاف کا وعدہ کر کے اس نے ہمارے ہتھ  
 سے آدمیوں کو اپنا حامی بنایا۔ ہمیں شہر کے اس پاس آباد ہونے کی اجازت مل گئی  
 لیکن بعض نے اس کے وعدوں پر یقین نہ کیا اور وہ یہاں سے دور پہاڑوں میں جا کر  
 آباد ہو گئے۔  
 رام داس نے ہم سے کوئی بد عہدی نہیں کی لیکن شہر کے تمام لوگ ہمیں تنہا  
 سمجھتے ہیں۔ ہمیں وہاں جانے کی اجازت نہیں۔ ہم ان کے مندروں کے قریب سے  
 نہیں گزر سکتے۔ ہم جب تک ان لوگوں کے دشمن سمجھے۔ خود کو انسان سمجھتے تھے  
 اور اب ان سے صلح کر کے شوہر اور اچھوت بن گئے ہیں۔ ہمارا ہی قوم کے وہ لوگ  
 جو اب تک پہاڑوں میں چھپ کر آزادی کا سانچہ لے رہے ہیں۔ زیر زمین اور  
 اچھی چراگاہوں سے محروم ہیں لیکن مجھے ان کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ آزادی ایک  
 ایسی نعمت ہے جس پر زندگی کا ہر آرام قربان کیا جاسکتا ہے۔ چند برس کی قلائی  
 کے بعد ہمارے دماغ سے آزادی کا تصور مٹ چکا ہے۔ ہم ہمیشہ کے لیے ان  
 لوگوں کو اپنے اوپر حکومت کا حق دے چکے ہیں۔ اب ہماری سب سے بڑی خواہش  
 یہ ہے کہ ہم ان کے مندروں میں جا کر ان کے دیوتاؤں کی پوجا کر سکیں۔ ان کے کنوؤں  
 سے پانی پی سکیں اور ان کے شہر میں کوئی دیکھ نہ سکے۔ رام داس نے آج تک ہم میں

بیسے کسی کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا لیکن تمہاری جھوٹی جلاتے اور مادھو کو  
 پکڑا کر لے جانے کی وجہ جو ہمیری سمجھ میں آ سکتی ہے یہی ہو سکتی ہے کہ اسے کسی طرح  
 یہ علم ہو گیا ہے کہ تم ہمارے سردار کی بیٹی ہو اور سردار کے نواسے کا ہم لوگوں میں سنا  
 زیادہ خطرناک سمجھتے ہوں گے لیکن میں حیران ہوں کہ انہیں یہ علم کیسے ہو گیا؟  
 کنول نے کہا: اور تو کسی کو پتہ نہیں۔ سردار کا بیٹا ہمارے گھر آیا تھا۔ اس  
 نے شیانے کے پتا کی انگوٹھی دیکھ کر ہمیں پہچان لیا تھا۔ لیکن وہ بھلا  
 کیا شیانے نے کنول کا فقرہ پورا نہ سونے دیا۔ تو ذرا بولی نہیں مانتا۔ وہ ایسا  
 نہیں رہتا۔ ہمارے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔  
 کنول نے کہا: بیٹی! تو ان لوگوں کو نہیں جانتی۔ یہ لوگ خطرے کو کوسوں دور سے  
 دیکھ لیتے ہیں۔ رندھیر کو میں نے بھی کئی دفعہ شکار پر جاتے دیکھا ہے۔ وہ شکل و صورت  
 سے بہت رحم دل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں کسی کی شکل دیکھ کر دھوکا نہیں کھانا چاہیے  
 ان لوگوں کے چہرے ملائم ہیں لیکن دل پتھر کی طرح سخت ہیں۔  
 وہ شیانے جواب دیا: لیکن وہ اسی رام داس کا بیٹا ہے جس کی تم تعریف  
 کرتے تھے۔  
 ہاں! یہ میں جانتا ہوں کہ رام داس ان لوگوں سے مختلف ہے لیکن وہ  
 ہم ایسے ایک سلوک بھی اپنی بھلائی کے لیے کرتا ہے۔ یہ اس کی نرمی کا نتیجہ ہے  
 کہ ہماری آدھی سے زیادہ قوم جسے غلام رکھنے کے لیے اسے ہر وقت ہزاروں  
 سپاہیوں کی ضرورت ہوتی، آج اس کے ڈیڑھ دو سو سپاہیوں کے اشاروں پر  
 ناپھرتی ہے۔ وہ ہمیں حکم دیتے ہیں کہ ہمارے شہر میں نہ آؤ اور ہم اس کے قریب سے  
 نہیں گزرتے۔ یہ شہر بھی وہ ہے جس کے مکانات کے نیچے ہماری جھونپڑیوں کی  
 راکھ دی ہوئی ہے۔ تم سوچو کہ اگر ہم ان کے کنوؤں پر چڑھ جائیں یا مندروں

میں داخل ہو جائیں تو رام داس بہاؤے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ اب تم ہی بتاؤ کہ جھونپڑی رام داس کی اجازت کے بغیر کوئی جلا سکتا تھا؟ اور مادھو کو اس کے حکم کے بغیر کوئی پکڑ کر لے جاسکتا تھا؟

تیجیو کے دلائل کے سامنے شانتا کی پیشین گوئی وہ دل ہی دل میں دھیمہ کے خلاف پیدا ہونے والے شکوک کے خلاف جنگ کر رہی تھی۔

کنول نے کہا: لیکن اب کیا ہو گا وہ مادھو کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ تیجیو نے جواب دیا: "مادھو کے لیے میری جان حاضر ہے لیکن مجھے امید نہیں کہ بہت سے لوگ میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

پانچ چھ آدمیوں کی آواز آئی "ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔"

کنول نے ان کی طرف دیکھ کر بعد دیکھ کر دیکھا وہ سب کے سب بوڑھے تیجیو کے ہم عصر اور کنول کے باپ سے پرانے وفاداروں میں سے تھے۔ نوجوانوں کے چہروں پر ہم دہائی کی بھانے خوف غالب تھا۔ شہزادوں کے متعلق وہ کسی بُرے خیال کو اپنے دل میں جگہ دینا بھی ایک پاپ سمجھتے تھے۔ عورتوں کو کنول کے بیٹے سے زیادہ اپنی جھونپڑیاں عزیز تھیں۔ مائیں اپنے بیٹوں، بیویاں اپنے شوہروں اور بہنیں اپنے بھائیوں کے ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر کی طرف چل دیں کنول کے پاس صرف چھ آدمی اور ایک چودہ سال کا لڑکا رہ گئے۔ یہ لڑکا تیجیو کا پوتا تھا اور اس کا نام لالو تھا۔

کنول نے کہا: "سب ڈر گئے ہیں نے انہیں شہزادوں کے ساتھ لڑنے کو تو نہیں کہا تھا۔"

لالو نے آگے بڑھ کر کہا: "میں تمہارے لیے لڑوں گا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔"

کنول نے اس کے سر پر ہار سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا: "بیٹا اتم کون ہو؟"

تیجیو بولا: "یہ میرا پوتا ہے۔"

لالو نے تیجیو سے پوچھا: "بابا! میں شہر جا کر مادھو کا پتہ لگاؤں؟"

کنول نے حیران ہو کر کہا: "تم! نہیں بیٹا! جاؤ تم گھر جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ تیجیو کی طرف متوجہ ہوئی۔ چچا اتم شانتا کو اپنے گھر لے جاؤں خود شہر جاتی ہوں۔ رام داس سکھ دیو کا دوست تھا اس نے ہماری جان اس وقت بچائی تھی جب ہم راجہ کی قید میں تھے اور صبح ہم دونوں کا بلیدان دیا جانے والا تھا۔ اب بھی مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری مدد کرے گا۔ اگر مادھو کو اس نے کوئی خطرہ محسوس کر کے گرفتار کیا ہے تو میں اس کی تسلی کر دوں گی۔ اگر اسے ہمارا اس جگہ رہنا پسند نہ ہو تو میں اس سے یہ ملک چھوڑ دینے کا وعدہ کر دوں گی وہ یقیناً مادھو کو چھوڑ دے گا۔"

تیجیو نے کہا: "لیکن رام داس کے گھر تک تمہاری رسائی بہت مشکل ہے۔" اول تو تمہیں شہر میں کوئی داخل نہ ہونے دے گا۔ اور اگر سچ بچا کہو ہاں تک چلی بھی جاؤ تو اس کے سپاہی تمہیں دُور سے دستکار دیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ الفاظ کی بجائے انیٹیں استعمال کریں اور اس وقت تو شہر کا دروازہ بھی بند ہوگا۔ میں لالو کو بھیجتا ہوں یہ مادھو کو تلاش کرے گا۔ اگر اسے موقع ملا تو شاید اس کی بھی مدد بھی کر سکے۔"

کنول نے پوچھا: "لالو کون ہے؟"

تیجیو نے اپنے پوتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا: "یہی۔"

کنول نے کہا: "نہ چھاپے نہ بھیجو، یہ بچہ ہے۔ یہ کیا کریگا وہاں جا کر؟"

تیجھ نے جواب دیا۔ بیٹی! تو اسے نہیں جانتی۔ شہر کا کوئی گھر ایسا نہیں،  
جہاں یہ نہیں جاتا۔

لیکن وہ اسے کچھ نہیں کہتے۔

یہ آج صبح کسی کے قابو میں نہیں آیا۔ رات کے وقت شہر کی دیوار پھاند  
کر ان کے گھروں سے کھانے پینے کی چیزیں چڑا لانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل  
ہے۔ اس کا رنگ بھی اپنے باپ کی طرح سفید ہے اور وہ دن کے وقت بھی ان ہی  
کے چوری کیے ہوئے کپڑے پہن کر ان کے گھروں اور مندروں میں چلا جاتا ہے۔  
اب تم میرے گھر چلو لاؤ صبح سے پہلے کوئی اچھی خبر لے کر آئے گا۔ اگر کسی  
طرح مامو کو قید سے نکال لایا تو تم تمہیں پہاڑوں میں پہنچا دیں گے۔

مامو کے متعلق کنول کے خدشات نے اسے تیجھ کی دعوت قبول کرنے  
پر آمادہ کر لیا۔ اس نے کہا۔ اب اور تو کچھ نہیں رہ گیا یہ چار پائیاں اٹھالیں۔

شانانے موقع پا کر لالو کا بازو پکڑ لیا اور اسے ذرا ایک طرف لے جا کر  
آہستہ سے کہا۔ لالو! تم شہر کا ہر گھر جانتے ہو؟

اس نے جواب دیا۔ بہت اچھی طرح۔

تم نے زندہ حیر کو دیکھا ہے؟

کئی بار۔

اس کے گھر کا پتہ ہے؟

واہ! یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی ہر روز شہر چلتے اور اسے زندہ حیر کے گھر کا  
پتہ نہ ہو۔

اچھا لالو! تم میرے بھائی ہو تا جاؤ۔

لالو نے خوش ہو کر اشارات میں سر ہلایا۔

میرا ایک کام کر دو گے؟

ضرور کروں گا۔

تم زندہ حیر کے پاس جا کر اسے کہو کہ سانپ کے زہر سے شاننا کی حالت پھر  
خراب ہو گئی ہے۔ وہ مرنے سے پہلے تمہیں دیکھنا چاہتی ہے اور لو! یہ انگوٹھی اسے  
دینا۔

لالو نے انگوٹھی لے لی اور کہا۔ بس میں ابھی جاتا ہوں۔ صرف گھر جا کر کپڑے  
بدلوں گا۔

شانانے کہا۔ اور دیکھو میں تمہیں ہر روز دو دھ اور بکھن دیا کروں گی۔  
لالو نے جواب دیا۔ اول ہوں۔ دو دھ اور بکھن سے مجھے نفرت ہے میں  
صرف اونچی ذات والوں کے گھر کے پکوان کھایا کرتا ہوں؟

شانانے کہا۔

شانانے کہا۔

شانانے کہا۔

شانانے کہا۔

شانانے کہا۔

شانانے کہا۔

نے اس کا حسب نسب پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی وہ ان کے آداب معاشرت اور پوجا پاٹ کے تمام طریقوں سے واقف ہو چکا تھا۔

لاٹونین پہر رات گئے شہر میں داخل ہوا۔ رام داس کے مکان کا دروازہ بند تھا اور پہرے دار دیوار کے سہارے بیٹھا خڑائے لے رہا تھا۔ مکان کی دیوار بہت اونچی تھی۔ لالو نے پچھلی طرف جا کر دیوار کے ساتھ اُگے ہوئے آم کے درخت سے سیڑھی کا کام لیا اور مکان کے اندر پہنچ گیا وہ اس مکان کے ہر کمرے سے واقف تھا۔ رام داس اور رند جیگر میوں میں مکان کی چھت پر سویا کرتے تھے وہ بے پاؤں سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا چھت پر پہنچا لیکن آج خلاف معمول وہاں پر صرف ایک چارپائی تھی۔ اس نے جھک کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس پر سونے والا رام داس ہے لیکن رند میر کہاں ہے؟ اس نے اپنے دل سے سوال کیا۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ نیچے اترا۔ صحن میں چند نوکر سو رہے تھے اسے خیال آیا کہ شاید رند میر آج ان کے پاس سو گیا ہو لیکن انہیں اچھی طرح دیکھنے کے بعد اسے پھر مایوسی ہوئی۔

پوچھنے سے کچھ دیر پہلے وہ جس راستے مکان میں داخل ہوا تھا، اسی راستے واپس نکل آیا۔ اب کسی اور طرف رخ کرنے سے پہلے اس نے کسی جگہ بیٹھ کر صبح کا انتظار کرنا ضروری سمجھا لیکن اسے بھوک محسوس ہوئی۔ شہر کے باہر ایک باغ میں اسے ایک پورے کے آم بہت پسند تھے وہ اس طرف چل دیا لیکن پندہ بیس قدم اٹھانے کے بعد وہ ایک مکان میں کسی کی آواز سن کر رک گیا۔

کوئی عورت چکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی:

”ماتا اب مجھے جانے دو۔ بھگو ان کے لیے مجھے جانے دو۔ وہ زردوش

## فشرافی

چند اہول کی بستیاں میں کوئی ایسا نہ تھا جسے لالو کے ساتھ دل چسپی نہ تھی۔ وہ بلا کا چھت اور بے حد نڈر تھا۔ بھاگنے، تیرنے اور درختوں پر چڑھنے میں کوئی اس کا ہم پند نہ تھا۔ اس کی شرارتوں کی داستانیں ہر بچے اور ہر بوڑھے کی زبان پر تھیں اسے جھگ کے درندوں کا خوف تھا نہ شہر کے مذہب انساؤں کا ڈر۔ اگر ایک دن اس کے متعلق یہ خبر مشہور ہوتی کہ وہ جھگ سے ریچھ کا بچہ پکڑ لیا ہے، تو دوسرے دن یہ سنا جاتا کہ وہ شہر کے کسی معزز آدمی کے تے کپڑے یا کسی اونگٹے ہوئے سپاہی کے ہتھیار اٹھا لیا ہے۔

مان باپ کا سایہ بچپن میں سر سے اٹھ جانے کے بعد اس کی دیکھ بھال کی تمام ذمہ داری تجو پر تھی۔ تجربے سے اسے ایک اچھا ماہی گیر اور ایک فرض شناس چڑیا بنانے کے لیے بہت جتن کیے لیکن لالو پر اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ چنانچہ اسے چودہ سال کی عمر تک سمجھانے، گالیاں دینے اور پیٹنے کے بعد مایوس ہو کر اس نے نہ صرف اس کے مشاغل میں دخل دینا ترک کر دیا بلکہ آہستہ آہستہ ان میں دلچسپی لینے لگا۔

شروع شروع میں لالو نے تاریک راتوں میں شہر کے محلات اور مندروں کی سیر کی۔ لیکن اب وہ دن کے وقت بھی وہاں سے ہوتا تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا کپڑے وہ کئی سال کی ضرورت سے زیادہ جمع کر چکا تھا۔ اس لیے شہر میں کبھی کسی

ہے اس نے مورتیاں نہیں چرائیں۔ اگر تیار ان کے گھر جانا پاپ تھا تو اس کی سزا  
بہیں ملنی چاہیے نہ کہ اسے اور یہ پاپ نہیں تھا۔ اس لڑکی نے رندھیر کی جان بچائی تھی  
میں اس کی خبر کو گئے تھے۔

دوسری عورت کہہ رہی تھی کہ "موتنی اپنے باپ کے مرنے پر کلنگ کا ٹکڑہ لگاؤ  
کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا؟"  
"نہیں ماما! مجھے جانے دو۔ اگر اس کا بلیڈان دیا گیا تو میں دریا میں ڈوب  
مروں گی۔"

"موتنی! میرے دودھ کی شرم کو مندر میں جا کر تمام لوگوں کے سامنے اپنے  
باپ کے سر پر خاک ڈالو گی؟ وہ تمہیں کبھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"  
"تو ماما تم جا کر تیا کو سمجھاؤ وہ تمہاری بات ضرور مانے گا۔"  
"نہیں وہ اس کا بلیڈان مینے کی قسم کھا چکا ہے۔ آج اس نے کسی پرچہ  
کا بھی اعتبار نہیں کیا وہ خود مندر میں پہرے رہا ہے۔"  
"پھر بھگوان کسے لیے مجھے رندھیر کے گھر جانے دو۔ رندھیر کے پاس کو اگر  
یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی بہن نے رندھیر کی جان بچائی ہے تو وہ ضرور اسے بچا  
لے گا۔"

"موتنی بھگوان کے لیے چپ رہو۔ کیا رندھیر یہ اپنے پاس کو نہیں تاسکتا؟"  
"ماما تم خود کہتی ہو کہ رندھیر کو ٹھٹھی میں بند ہے اور اسے یہ بھی معلوم  
نہیں کہ سپاہی مادھو کو پکڑ کر لے آئے ہیں۔"  
"میرے سامنے بار بار اس ذلیل کتے کا نام نہ لو۔ کوئی سن لے گا تو کیا  
کہے گا؟"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔ اگر اس کا بلیڈان دیا گیا تو کوٹھے کی چھت پر چڑھ

کر چلاؤں گی۔ یہ پاپ تھا وہ بے گناہ تھا۔ ماما بھگوان کے لیے اس کی جان بچاؤ  
میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں کبھی جھیل پر نہیں جاؤں گی۔"  
اس کے بعد دیر تک چمکیوں کی آواز آتی رہی۔

(۲)

یہ باتیں سننے کے بعد لالو آموں کو بھول گیا اور سیدھا کالی دیوی کے مندر  
کی طرف بھاگا۔ رات کی سیاہی صبح کی دھندلی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ مندر کے  
قریب پہنچ کر اسے شکر آتا ہوا دکھائی دیا۔ شکر کا چہرہ مجلس جانے پر زیادہ  
سیاہ ہو چکا تھا۔ اس نے لالو کو دور سے دیکھتے ہی پوچھا: "پرہنت جی آگئے؟"  
"کون سے پرہنت جی؟"

"کالی دیوی کے مندر کے۔"  
"وہ کہاں گئے ہوئے تھے؟"

"دھرم پور۔ سردار نے انہیں لانے کے لیے آدمی بھیجے تھے۔"  
"شاید آگئے ہوں مجھے پتہ نہیں لیکن تمہارے منہ کو کیا ہوا؟"

"شکر نے خشک لہجے میں جواب دیا: "کچھ نہیں اور بڑا آتا ہوا آگے چل دیا۔"  
لالو بھاگتا ہوا کالی دیوی کے مندر میں پہنچا۔ مادھو رستوں میں جکڑا ہوا

مندر کے سامنے پڑا تھا اور ارجن کے علاوہ پندرہ سپاہی اس سے ذرا دور بیٹھ  
کر بیٹھے ہوئے تھے۔ لالو نے وہاں ایک لمحہ بھی ضائع کرنا مناسب خیال نہ کیا اور

والپس شہر کی طرف بھاگا۔ راستے میں اسے مندر کی طرف آنے والے مردوں اور  
عورتوں کی کئی ٹولیاں ملیں۔

رام داس کے گھر کا دروازہ اب کھلا تھا اور وہ کسی قسم کی جھجک سے بغیر بغیر اندر داخل ہو گیا۔ رام داس ایک وسیع کمرے میں شہر کے چند سرکردہ برہمنوں اور کھشتریوں کے درمیان بیٹھا اُن سے باتیں کر رہا تھا۔ گفتگو کا موضوع مادھو کا بلیدان تھا۔

لالو نے کچھ دیر دروازے سے باہر کھڑے ہو کر یہ باتیں سنیں اور پھر کان میں اُدھر اُدھر پھیر کر رندھیر کو تلاش کرنے لگا۔

رندھیر کی کوٹھڑی تلاش کرنے میں اسے دیر نہ لگی لیکن دروازے کو قفل لگا ہوا تھا اور باہر ایک پہرے دار کھڑا تھا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد لالو کے ذہن میں ایک تدبیر آئی اور اس نے پہرے دار کے پاس جا کر کہا: "سردار نے تمہیں بلایا ہے۔"

پہرے دار رام داس کے کمرے کی طرف چل دیا اور لالو نے جلدی سے رُاز کے قریب جا کر رندھیر کو آواز دی۔

"کون ہے؟" رندھیر نے اندر سے پوچھا۔

لالو نے جواب دیا: "باتوں کا وقت نہیں۔ سنو آج کالی دیوی کے مندر میں مادھو کا بلیدان دیا جائے گا۔ مجھے شانتا نے بھیجا ہے وہ سانپ کے زہر سے مر رہی ہے اس نے مجھے اپنی انگوٹھی دے کر کہا ہے پاس بھیجا ہے اور وہ کتنی تھی میری بھائی کی جان بچاؤ۔ یہ لو میں اسے کوار کے نیچے سے اندر پھینک رہا ہوں۔"

رندھیر نے جلدی سے کہا: "ٹھہرو! ٹھہرو! انگوٹھی اندر مت پھینکو۔ تم اگر میرے پتا کے پاس جا سکتے ہو تو یہ انگوٹھی ان کے پاس لے جاؤ۔ اُن سے کہو۔ یہ ان کے دوست کی آخری نشانی ہے۔ اس پر جس شخص کا نام ہے۔ وہ مادھو کا باپ ہے۔"

پہرے دار بر رُتا ہوا واپس آ رہا تھا اور لالو اسے دیکھ کر برآمدے کے ستونوں کے نیچے چھپتا ہوا بڑے کمرے کی طرف کھسک آیا۔

رام داس کے کمرے میں لوگوں کی تعداد اب پہلے سے زیادہ ہو چکی تھی۔ لالو کو پیام رسانی کا فرض ادا کرنا مشکل نظر آیا۔ تھوڑی دیر وہ دروازے میں کھڑا موقع ملنے کا انتظار کرتا رہا اتنے میں ایک شخص بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے سردار سے کہا: "ہمارا ج! پروہت جی پہنچ گئے۔ مندر میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔" رام داس نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا: "آپ چلیں! میں ابھی آتا ہوں۔" لوگ یکے بعد دیگرے نکل آئے۔ رام داس نے ایک شخص کو ہاتھ کے اشارے سے روک لیا اور آہستہ سے کہا: "گوپال! میں شاید وہاں نہ آؤں۔ مجھ سے یہ تماشا نہ دیکھا جائے گا، پروہت سے کہہ دینا میرا زیادہ دیر انتظار نہ کرے۔"

گوپال "بہت اچھا" کہہ کر چل دیا لیکن دروازے کے قریب پہنچ کر پھر واپس مڑا اور کہنے لگا:

"ہمارا ج! آپ نے اس لڑکے کو نہیں دیکھا؟"

رام داس نے جواب دیا: "نہیں میں نے سنا ہے کہ وہ بہت خوش شکل نوجوان ہے۔"

"ہمارا ج! اس کی شکل سکھ دیو جیسی ہے۔"

"سکھ دیو جیسی؟"

"ہاں ہمارا ج! گوپال یہ کہہ کر مکان سے باہر نکل گیا اور رام داس کمرے میں پھٹنے لگا۔ لالو چپکے سے اندر داخل ہوا۔

رام داس اسے دیکھتے ہی چلایا: "تم کون ہو؟ جاؤ یہاں سے؟"

"ہمارا ج!..... یہ..... انگوٹھی" لالو نے اپنا فقرہ پورا کیے بغیر انگوٹھی

رام داس کے ہاتھ میں تھادی۔ رام داس نے انگلیوں سے کربے پر دانی سے ایک  
طاقتی میں رکھ دی۔

لالو نے پھر بولنے کی جرات کی "مہاراج! یہ آپ کے دوست کی...!"  
رام داس نے اس کا کان پکڑ کر دروازے سے باہر نکالتے ہوئے کہا جس  
کی ہوگی اسے مل جائے گی۔ میرے کان نہ کھاؤ۔"

لالو نے آخری بار بہت کی۔ "مہاراج یہ...!"

"بھاگ جاؤ یہاں سے۔ اسے کوئی نہیں ہے؟"

لالو شکست خوردہ سا ہو کر وہاں سے چل دیا اور برآمدے کے ایک ستون  
کے قریب کھڑا ہو کر نئی نئی تدابیر پر غور کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص شور مچاتا ہوا  
مکان کے اندر داخل ہوا۔

"مہاراج! مہاراج!! غضب ہو گیا!!!"

رام داس چیخ پکار سن کر ہاتھ میں تلوار لیے کمرے سے باہر نکلا اور اس نے  
پوچھا: "کیا ہوا؟"

"مہاراج! غضب ہو گیا۔ شہر میں ایک شور و گھس آیا ہے اس کے ہاتھ میں  
تلوار ہے۔ سپاہیوں نے اسے روکا لیکن وہ کہتا تھا میں تمہارے سردار سے ملنا  
چاہتا ہوں۔ وہ دو سپاہیوں کو زخمی کر چکا ہے۔ ایک سپاہی کی تلوار اس کے سینے  
میں لگی لیکن اسے معلوم بھی نہیں ہوا۔ مہاراج! وہ راکشس ہے۔ وہ اس طرف آ  
رہا ہے اسے روکنے والا کوئی نہیں شہر کے تمام آدمی مندر میں جا چکے ہیں۔ سرکار  
وہ کیا ہو گا؟"

لالو نے باہر سے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک شخص خون آلود تلوار ہاتھ  
میں لیے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کی طرف آ رہا تھا۔ یہ بدھو تھا۔ اس کے پاؤں

لاکھڑا رہے تھے اور برہنہ سینے سے خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بچھے  
ہوئے تھے اور آنکھوں سے مظلومیت ٹپک رہی تھی۔

رام داس نے کہا: "ٹھہرو! تم کون ہو؟ اور تلوار سونت کر آگے بڑھا۔  
بدھو اسے سر کی جنبش اور ہاتھ کے اشارے سے سمجھانے کی کوشش  
کر رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ لڑنے کے ارادے سے نہیں آیا۔ اس کی آنکھوں کی  
خاموش فریاد سے متاثر ہو کر رام داس نے پوچھا: "تم یہاں کیوں آئے؟"  
بدھو کے بچھے ہوئے ہونٹوں میں ایک خفیف سی جنبش ہوئی۔ اس نے پچھا  
"تم رام داس ہو؟"

"ہاں کمو! کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"مادھو، سکھ یوگا کا بیٹا ہے۔ رندھیر کو معلوم ہے، اسے بچاؤ! اسے بچاؤ!!  
وہ سکھ یوگا کا بیٹا ہے اسے!!!"

آخری الفاظ آہستہ آہستہ چند بار دہرانے کے بعد اس کے منہ سے خون کی  
دھار بہہ نکلی اور وہ نیچے گر پڑا۔ اس کے ہونٹ بدستور مل رہے تھے۔ وہ مہرشی  
کی حالت میں اسے بچاؤ! اسے بچاؤ! دہرا رہا تھا۔ اس کی آواز خفیف سے خفیف تر  
ہو رہی تھی یہاں تک کہ صرف ہلتے ہوئے ہونٹ نظر آ رہے تھے اور آواز سنا ہی نہ  
دیتی تھی۔ بدھو نے ایک ٹھہر جھری لی اور اس کے ہونٹ آخری بار ایک دور سے  
سے جدا ہوئے۔ میدان ہستی کا تھکا ہوا مسافر ملک عدم پہنچ چکا تھا لیکن بے جان  
آنکھیں ابھی تک رام داس کے چہرے پر اپنی فریاد کا اثر ڈھونڈ رہی تھیں۔ لالو  
اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔

بدھو کی موت نے رام داس پر بھی ایک گہرا اثر کیا۔ کچھ دیر بدھو کو پہچاننے کی ناکام کوشش کے بعد وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا زندھیر کی کوٹھڑی کی طرف بڑھا اور پہرہ دار کو کوٹھڑی کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔

دروازہ کھلتے ہی زندھیر لپک کر باہر نکلا اور رام داس کی طرف غصہ، نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہوئے بولا،

”پتا جی! اب تو آپ کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا ہو گا لیکن میں پوچھتا ہوں کیا انصاف یہی تھا۔ سماج کا قانون توڑنے والا آپ کا بیٹا تھا لیکن میدان کسے لیے آپ نے ایک ایسے بے گناہ شخص کو منتخب کیا جس کے خون کا ہر قطرہ صدیوں تک سماج کے ماتھے پر بدنامی کا داغ بن کر چمکتا رہے گا۔“

”زندھیر! میرے ساتھ آؤ۔“ رام داس نے یہ کہہ کر زندھیر کا بازو پکڑ لیا اور اسے اس جگہ لے آیا جہاں بدھو پڑا ہوا تھا۔ رام داس نے بدھو کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زندھیر سے پوچھا، ”اسے جانتے ہو، یہ کون ہے؟“

زندھیر کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا بدھو کی لاش کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے پُر غم آنکھیں اوپر اٹھائیں اور رام داس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”پتا جی! یہ آپ کی دوسری فتح ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔“  
ان الفاظ کے ساتھ زندھیر کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُٹھ آیا بدھو کی تلوار اس کے ساتھ پڑی ہوئی تھی۔ زندھیر نے اس کا دستہ پہچان لیا اور اٹھا کر رام داس کو پیش کرتے ہوئے کہا،

”پتا جی! یہ مادھو کے باپ اور آپ کے دوست کی دوسری نشانی ہے۔“

انگوٹھی میں نے آپ کو بھیج دی تھی۔

رام داس نے تلوار ہاتھ میں پکڑ لی اور پوچھا، ”کونسی انگوٹھی؟“  
زندھیر ادھر ادھر دیکھنے لگا اور لاٹھیاں کا مطلب سمجھ کر بھاگتا ہوا کمرے میں جا کر انگوٹھی لے آیا اور بولا، ”ماراج یہ ہے۔ میں نے ابھی آپ کو دی تھی لیکن آپ نے اسے طلاچے میں پھینک دیا تھا۔“

رام داس دوسرے ہاتھ میں انگوٹھی پکڑ کر جواب طلب نگاہوں سے زندھیر کی طرف دیکھنے لگا۔

زندھیر نے کہا، ”پتا جی! اس انگوٹھی پر سکھ دیو کا اور اس تلوار پر آپ کا نام لکھا ہوا ہے۔“

رام داس نے یکے بعد دیگرے تلوار کے دستے اور انگوٹھی کی طرف دیکھا،  
اور دونوں چیزیں اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گر پڑیں۔ اضطراری حالت میں اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

”اُٹ بھگوان! کیا یہ ممکن ہے؟“ اس نے زندھیر کی طرف دیکھا اور کہا،  
”زندھیر! تمہیں یقین ہے کہ وہ سکھ دیو کا بیٹا ہے؟“

زندھیر نے جواب دیا، ”پتا جی! اب میرے یقین دلانے سے کیا ہو گا کاش آپ مجھے کل رات بات کرنے کا موقع دیتے۔ اب جو ہونا تھا سو ہو چکا۔“

رام داس نے کہا، ”نہیں! ابھی کچھ نہیں ہوا۔ وہ ابھی تک زندہ ہے میں اسے بچا سکتا ہوں۔“ میں اسے بچاؤں گا۔“

یہ کہہ کر رام داس اصل بل کی طرف بھاگا۔ زندھیر نیچے پڑی ہوئی تلوار اور لاٹھیاں اٹھا کر پیچھے بھاگے۔

چند لمحوں کے بعد رام داس اور زندھیر گھوڑوں کی نگلی پیٹھ پر سوار مندر کا

رنج کر رہے تھے۔ لالہ زندھیر کے ساتھ چھٹا ہوا تھا۔

(۴)

کالی دیوی کی مورتی کے پجاری اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ مادھو کو رسیوں میں جکڑ کر مورتی کے سامنے لٹا دیا گیا تھا۔ ایک پجاری اس کے سر پر چمکتا ہوا برچھالیے کھڑا تھا۔ پردہت مقدس زبان میں کوئی تعجب گارہا تھا۔ مادھو کے چہرے پر خوف کی بجائے ایک غیر معمولی عزم و استقلال تھا اس کی آنکھیں ایک ایسے سکون کی آئینہ دار تھیں جو ایک مسافر کو لمبے اور تکلیف سفر کے بعد منزل مقصود پر پہنچ کر حاصل ہوتا ہے۔ وہ ہر لمحہ دنیا سے دور اور جگہ سے نزدیک جا رہا تھا۔ وہ دنیا کے ہر کام میں بھگوان یا کائنات کی ایک زبردست طاقت کی مرضی کا قائل ہو چکا تھا۔ مونی کے تصور سے اس کے دل میں زندہ رہنے کی خواہش اسے تشویشی دیکھ کے لیے پریشان کر دیتی۔ لیکن وہ ہر بار اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کرتا کہ مونی اس کے پرواز کی آخری منزل نہ تھی وہ صحیح منزل مقصود کی طرف رہنمائی کرنے والا ایک روشن ستارہ تھا۔

جب جلاؤ برچھالے کر سر پر کھڑا ہو گیا تو ایک لمحہ کے لیے اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی لیکن اس نے فوراً اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ اب ڈرنے یا کانپنے سے کچھ نہیں بنے گا۔ اگر بھگوان تجھے زندہ رکھنا چاہتا ہے تو یہ بڑا تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور اگر اسے تیرا رہنا منظور نہیں تو دنیا کی کوئی طاقت تجھے نہیں بچا سکتی۔

بھجن گانے والے پردہت کی آواز بلند ہوتی اور تماشا "کالی دیوی کی

جے"، کالی دیوی کی جے کے نعرے لگانے لگے۔ پجاری دونوں ہاتھوں سے برچھا بلند کر کے پردہت کے اشارے کا انتظار کرنے لگا۔ اپنے تمام عزم و استقلال کے باوجود مادھو موت کو اس قدر قریب سے دیکھنے کی بہت ترسکا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

لالو بھاگتا ہوا مندر میں داخل ہوا۔ اس نے بلند آواز میں کہا: "ٹھہر جاؤ! ٹھہر جاؤ! اہم راج آتے ہیں۔"

پردہت کی آواز گلے میں رک گئی اور پجاری کا برچھالہ نیچے جھک گیا۔ لوگ مڑ مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ اتنی دیر میں رام داس اور زندھیر مندر میں داخل ہو چکے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے کانٹا پھوسی کرنے لگے۔ رام داس کچھ کہے بغیر لوگوں کو ادھر ادھر بٹاتا ہوا مورتی کے قریب پہنچا اور مادھو کو دیکھ کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم سب اپنے اپنے گھر چلے جاؤ آج بیدار نہیں ہو گا۔"

دن کی روشنی اگر رات کی تاریکی میں تبدیل ہو جاتی تو یہی شاید لوگ اس قدر بدحواس نہ ہوتے۔

پردہت نے سرائیکی کی حالت میں رام داس کی طرف دیکھا اور کہا: "ہمارا راج! بیدار کی تمام رسمیں پوری ہو چکی ہیں۔ اب اسے روکنا نہ آپ کے اختیار میں ہے نہ ہمارے بس میں۔"

"مجھے ظلم کی روک تھام کا ہر وقت حق ہے" یہ کہتے ہوئے رام داس تلوار سے مادھو کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کاٹنے لگا۔

کالی دیوی کے مندر کا پردہت کچھ مرعوب ہو گیا لیکن بڑے مندر کے پردہ نے آگے بڑھ کر کہا: "ہمارا راج! آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ دھرم کی عزت کا معاملہ ہے۔"

رام داس نے بدستور رتیاں کاٹتے ہوئے جواب دیا: دھرم کی عزت بے انصافی میں نہیں انصاف میں ہے۔

پرودھت بولا: مہاراج! کیسی بے انصافی! اس نے مجھ سے۔ اس نے مورتیاں چرائیں اور برہمنوں کی سچائیت نے اس کے متعلق جو فیصلہ کیا تھا آپ اس سے بھی متفق تھے۔ اب آپ یہ کیا کر رہے ہیں یہ دیوی کے مندر کی توہین ہے۔ ارجن نے آگے بڑھ کر کہا: "نہیں! دیوی کی توہین نہیں ہوگی بلیدان ضرور ہوگا۔" عوام بھی شور مچانے لگے "ضرور ہوگا۔ ضرور ہوگا۔"

رام داس مادھو کی تمام رتیاں کاٹ چکا تھا وہ ارجن کی طرف دیکھ کر ذرا سخت لہجے میں بولا: "ارجن! تم جانتے ہو کہ یہ بے قصور ہے۔ اس نے مورتیاں نہیں چرائیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ مورتیاں کس کی ہیں؟ میں تمہاری عزت کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن اس پر ظلم نہیں کر سکتا۔" ارجن نے مذمت سے آنکھیں جھکا لیں لیکن لوگ بدستور شور مچا رہے تھے۔ "بلیدان ضرور ہوگا۔ بلیدان ضرور ہونا چاہیئے۔"

شہر کا سرکردہ برہمن جو راجہ کے دربار کے بڑے پرودھت کا رشتہ دار تھا بولا: مہاراج! آپ کو دھرم کی باتوں میں دخل مینے کا حق نہیں۔ آپ اسے یہاں سے نہیں لے جاسکتے۔ اگر آپ نے زبردستی کی تو ہم سب راجہ کے پاس جائیں گے۔"

رام داس نے جواب دیا: "میں انصاف کے معاملے میں کسی سے نہیں ڈرتا مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ مورتیاں اس نے خود بنائی ہیں مندروں سے نہیں چرائیں۔" مہاراج! آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ مورتیاں اس نے خود بنائی ہیں؟ رام داس نے کہا: "زندھیر! تم بتاؤ!"

زندھیر بولا: "میں نے اسے اپنی آنکھوں سے جھیل کے کنارے مورتی تراشتے دیکھا تھا۔"

"اور مجھن؟"

رام داس نے کہا: "جو لوگ اس پر مجھن گانے کا الزام لگاتے ہیں میں انہیں قابل اعتماد نہیں سمجھتا۔ زندھیر! اسے لے جاؤ۔"

برہمن سردار کے مقابلے میں اپنی شکست برداشت نہ کر سکے۔ وہ مندر میں جمع ہونے والے لوگوں کو بے حسی اور بزدلی کا طعنہ دے کر اکسانے لگے نصرت سے زیادہ کشتہ زنی ان کے طرف دار بن گئے۔

بڑے مندر کے پرودھت نے کہا: "مہاراج! اب ہمیں اس سے بحث نہیں کر رہے گناہ ہے یا گناہ گار۔ اب تمام رسمیں پوری ہو چکی ہیں اور بلیدان کسی حالت میں بھی نہیں رک سکتا۔"

کشتہ زنیوں کو برہمنوں کا ساتھ دیتے ہوئے دیکھ کر رام داس کو صدمہ ہوا اس نے کہا: "بہت اچھا! بلیدان ہوگا۔"

مندر میں کالی دیوی کی جے! اور مہاراج کی جے! کے نعرے بلند ہوئے۔ رام داس نے ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو خاموش کیا اور کہا: "لیکن بلیدان اس کا نہیں بلکہ میرا ہوگا۔"

بیسویں آوازیں ایک ساتھ نکلیں: "آپ کا؟"

"ہاں! میرا۔" رام داس نے یہ کہہ کر دیوی کے سامنے بیٹھ کر سر جھکا دیا اور کہا: "اگر بلیدان اسی قدر ضروری ہے تو میں حاضر ہوں۔ پرودھت جی! آپ تمام رسمیں پوری کر چکے ہیں۔ پجاری کو میری گون کاٹنے کا حکم دیجئے۔ میں دیوی کے احترام کے لیے اپنی جان دے سکتا ہوں لیکن اسے ایک بے گناہ کے خون کے چھینٹوں سے"

ابھی آ جاؤں گا۔

رام داس نے مسکراتے ہوئے زندھیر کی طرف دیکھا اور سوال کیا: "مادھو کی بہن کا کیا نام ہے؟"

اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے جواب دیا: "شنا۔"

رام داس نے کہا: "زندھیر! اس وقت تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

لیکن پتا جی! وہ مر رہی ہے۔

"کون شنا تا کیا ہوا اسے؟"

زندھیر اس سوال کا جواب دینا چاہتا تھا لیکن مندر سے چند برہمن شور

مچاتے ہوئے باہر آ رہے تھے۔ رام داس نے کہا: "اچھا تم جاؤ لیکن مجھے جلد اطلاع دینا۔"

زندھیر بھاگتا ہوا مندر سے باہر نکلا وہ درخت سے اپنا گھوڑا کھول رہا تھا کہ لالو بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے پوچھا: "آپ شہر جا میں گئے؟"

"نہیں، میں کہیں اور جا رہا ہوں۔ یہ کہہ کر زندھیر گھوڑے پر سوار ہو گیا، لیکن لالو نے اس کی باگ پکڑ لی اور کہا: "مجھے معلوم ہے کہ آپ شنا کو دیکھنے

کے لیے جا رہے ہیں لیکن وہ اپنے گھر پر نہیں۔" مجھے ساتھ لے چلئے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟"

"اچھا میرے پیچھے بیٹھ جاؤ! لیکن تم ہو کون؟ اور شنا کو کیسے جانتے

ہو؟ اور جب تم انگوٹھی لائے تھے وہ تمہیں کہاں سے ملی تھی؟"

لالو جواب دے بغیر چلا گیا، رام داس نے پیچھے بیٹھ گیا اور جب گھوڑا

سرٹ روڑنے لگا تو اس نے کہا: "میں آپ کو ایک خوش خبری سناؤں؟"

واغدا نہیں کر سکتا۔

رام داس انسانی فطرت کی کمزوریوں سے واقف تھا۔ اس کا یہ حربہ کارگر ہوا۔ برہمنوں کی زبان تھوڑی دیر کے لیے گنگ ہو گئی اور کھشتری پھر اس کے طرف بن گئے۔ ارجن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھالیا۔

رام داس نے پروہت کی طرف دیکھ کر کہا: "پروہت جی! بس اتنی سی بات سے گھبرا گئے؟"

یہ کہہ کر رام داس مادھو کا بازو پکڑ کر مندر سے باہر نکل آیا۔ زندھیر بھی اس کے ساتھ ہی نکلا۔ لوگ اس قدر بدحواس تھے کہ کسی کے دل میں ان کا راستہ روکنا کا خیال تک پیدا نہ ہوا۔

مندر سے باہر نکل کر رام داس نے پوچھا: "مادھو! سکھدیک کہاں ہے؟"

مادھو نے جواب دیا: "انہیں مرے ہوئے مدت ہو گئی۔"

تمہاری ماما کا نام کنول ہے نا؟"

مادھو نے اثبات میں سر ہلایا۔

رام داس نے کہا: "اچھا! اب تم فوراً گھر جاؤ۔ شہر کے لوگ تمہارا پیچھا کریں گے۔ تم اپنی ماں اور بہن کو لے کر پہاڑوں کی طرف نکل جاؤ۔ ادھر دیکھو! اس پہاڑی کے دامن میں ایک چشمر ہے۔ رات کے وقت وہاں پہنچ کر میرا انتظار کرنا میں کل صبح سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ جلدی جاؤ وقت ضائع نہ کرو۔ ان لوگوں کا جوش زیادہ دیر ٹھنڈا نہیں رہے گا۔"

احسان مندی کے الفاظ مادھو کے سینے میں گھٹ کر رہ گئے اور وہ کچھ کہے بغیر مندر کی چار دیواری سے باہر نکل کر بھاگنے لگا۔

زندھیر نے کہا: "پتا جی! اگر آپ اجازت دیں تو میں وہاں سے ہواؤں میں

زندھیر نے جواب دیا: اس وقت مجھے کوئی تجربہ خوش نہیں کر سکتی۔ کہو کیا کہتے ہو؟

لالو نے کہا: بات دراصل یہ ہے کہ شانا بالکل تندرست ہے۔  
زندھیر کا دل خوشی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ اس نے گھوڑے کی گلیں  
کھینچتے ہوئے مڑکر لالو کی طرف دیکھا اور کہا: بھگوان کے لیے سچ سچ بتاؤ!

لالو نے کہا: بات یہ ہے کہ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔

لیکن تم وہاں گئے کب؟

میں وہیں رہتا ہوں۔

وہاں؟

ہاں۔

تو کیا تم شہر میں نہیں رہتے؟

نہیں۔

تم کھشتی نہیں؟

نہیں۔

تو تم کون ہو؟

پہلے آپ وعدہ کریں کہ آپ مجھے گھوڑے سے نیچے نہیں پھینک دیں گے؟

وہ کیوں؟

میں ایک شودر ہوں۔

شودر! لیکن تمہارا لباس تو . . . . .

یہ سب آپ لوگوں کی دُیا ہے۔

مجھے تمہاری باتوں پر یقین نہیں آتا۔ تمہاری زبان بھی شہر کے لوگوں سے

ملتی ہے۔

اگر میں آپ کی طرح باتیں کرنا نہ سیکھتا تو اس قدر آزادی کے ساتھ آپ

کے گھروں اور مندروں میں نہ پھر سکتا۔

تم بہت نڈر معلوم ہوتے ہو۔ یہ کہہ کر زندھیر نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

جھیل کے قریب پہنچ کر زندھیر کو مادھو بھاگتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اس

کے قریب پہنچ کر گھوڑا روکتے ہوئے لالو سے کہا:

دیکھو ابھی اسے بدھو کے متعلق نہ بتانا۔

بہت اچھا! لالو نے جواب دیا۔

## اعتراف

غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے رام داس اور زندھیر اپنے مکان کے صحن میں بڑے درخت کے نیچے ایک چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ زندھیر اسے اپنی سرگزشت سنارہا تھا۔ جب وہ بچپن کی ابتدائی ملاقات سے لے کر جوانی کی آخری ملاقاتوں تک تمام واقعات بیان کر چکا تو رام داس نے کہا: "زندھیر! سچ کہو شانتا واقعی بہت خوب صورت ہے؟"

"پتا جی....! زندھیر نے شرماتا کر آنکھیں جھکا لیں۔

رام داس پھر بولا: "سکھدیو اور کنول کی بیٹی یقیناً خوبصورت ہوگی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم واقعی اس سے پریم کرتے ہو؟"

زندھیر نے جھجک کر آنکھیں اوپر اٹھائیں اور جواب دیا: "پتا جی!.... میں.... میں.... اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"تم جانتے ہو کہ تمہیں سکھدیو کی طرح تمام عمر کانٹوں پر چلنا پڑے گا۔ ان شہرہ دل اور ان خوب صورت محلات کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔"

"پتا جی! میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

"زندھیر! اگر میں یہ کہوں کہ تم اس لڑکی کا خیال چھوڑ دو تو؟"

"پتا جی! پھر میں یہ کہوں گا کہ آپ اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دیجئے"

"اب وہ کافی دُور جا چکے ہوں گے؟"

"ہاں پتا جی! میرا خیال ہے کہ وہ آدھا راستہ طے کر چکے ہوں گے۔"

"شانتا اب بالکل تندرست ہے نا؟"

"ہاں پتا جی! اس لڑکے نے جھوٹ بولا تھا۔"

"وہ تھا کون؟"

زندھیر نے اس سوال کے جواب میں لالو کے متعلق اپنی تازہ معلومات ظاہر کر دیں۔

رام داس نے کچھ سوچنے کے بعد سوال کیا: "زندھیر! تمہیں یقین ہے کہ کوئی مادھو سے پریم کرتی ہے؟"

"مجھے یقین ہے۔"

"اسے معلوم ہے کہ مادھو سکھدیو کا بیٹا ہے؟"

"نہیں۔ شاید اسے معلوم نہیں۔"

رام داس پھر سوچ میں پڑ گیا۔

موتہنی بھاگتی ہوئی مکان میں داخل ہوئی اور رام داس کے قریب پہنچ کر اس نے کہا: "چچا جی! چچا جی!! انہیں بچائیے۔ پتا جی شہر کے بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر ان پر دھاوا بولنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ ابھی وہ گھر پر ہیں۔ شہر کے تمام عرصہ بھی ہمارے گھر جمع ہیں۔"

رام داس نے جان بوجھ کر بے پروائی سے جواب دیا: "تمہیں کیا کمروں؟"

"چچا! آپ شہر کے سردار ہیں۔ پتا جی کو آپ منع کر سکتے ہیں۔ آپ نے اس کا بلیدان ہونے سے بچایا ہے۔ کیا اب اسے قتل ہوتا دیکھ کر خاموش رہیں گے؟"

"بیٹی! تمہیں اس کی فکر کیوں ہے۔ کمروں کا مکھا کون مٹا سکتا ہے؟"

موہنی رام داس سے مایوس ہو کر رندھیر کی طرف متوجہ ہوئی۔ رندھیر اقم ہی کچھ کرو وہ اسے زندہ جلا دینا چاہتے ہیں۔ بھگوان کے لیے جاؤ۔

رندھیر کے چہرے پر نشوونید کی بجائے اطمینان کے آثار دیکھ کر موہنی نے کہا: "تو یہ سب کچھ دکھاوا تھا۔ تمہارے سینے میں بھی وہی دل ہے جو دوسرے لوگوں کے سینوں میں ہے۔ تم بڑول ہو۔ ان الفاظ کے ساتھ موہنی کی آنکھوں سے آنسو نکلے۔ رام داس چپوڑے سے اٹھ کر نیچے اُترا۔ اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا: بیٹی! ایک شور کے ساتھ اس قدر ہمدردی۔

موہنی نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: "مجھے معلوم نہ تھا کہ تاجی کی طرح آپ بھی ایک شور کو انسان نہیں سمجھتے۔"

"بیٹی! مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اس سے اس قدر پریم کرتی ہو۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔"

"میں صرف اس کی جان بچانا چاہتی ہوں۔ وہ بے گناہ ہے۔"

"اب اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔ وہ اب بہت دور ہو چکا ہے۔"

"بہت دور کہاں؟"

"پہاڑوں میں۔"

"موہنی کے چہرے پر مسرت اور غم کی لہریں ایک دوسرے کا تعاقب کرنے لگیں۔ دل ایک بار دھڑکا اور میٹھ گیا۔ آنکھوں کے چراغ ایک لمحے کے لیے روشن ہوتے اور بجھ گئے۔ اس کے ہونٹوں سے درد کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی تو آپ، آپ نے اسے جلا وطن کر دیا؟"

رام داس نے جواب دیا۔ اس کی جان بچانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اسے کہیں فوراً بھیج دیا جائے۔

"دور کہاں جگہ؟"

"بس کسی ایسی جگہ، جہاں شہر کا کوئی آدمی نہ پہنچ سکے۔"

موہنی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہونے لگیں۔

رام داس نے کہا: "بائیں اقم اب بھی رو رہی ہو۔ اب تو تمہارے غم کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ وہ زندہ ہے اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔ اس سے زیادہ تم کیا چاہتی ہو؟"

موہنی نے رام داس کو کوئی جواب دینے کی بجائے رندھیر کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: "کیا اس کی ماما اور شانتا بھی اس کے ساتھ ہیں؟"

رام داس نے رندھیر کو جواب دینے کا موقع نہ دیا اور کہا: "ہاں! وہ بھی اس کے ساتھ ہیں اور رندھیر بھی اس کے پیچھے جانے والا ہے۔ یہ اس لڑکی کے لیے ہمیں تیاگ چکا ہے۔"

موہنی نے بے اختیار رام داس کے پاؤں پر گرتے ہوئے کہا: "چچا! میں بھی رندھیر کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔ میں اُس کے لیے تمام دنیا کو تیاگ سکتی ہوں میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

رام داس نے موہنی کا بازو پکڑ کر کہا: "لیکن تمہارا پتا، تمہاری ماما، ان سب کو چھوڑ دو گی؟"

"مجھے کسی کی پروا نہیں۔ موہنی پھوٹ پھوٹ کر روتی لگی۔

"لیکن دنیا کیا کہے گی؟"

"مجھے دنیا کی بھی پروا نہیں۔ چچا! مجھ پر دیا کروور نہ میں کہیں ڈوب مروں گی یا کسی پہاڑی پر چڑھ کر چھلانگ لگا دوں گی۔"

"اچھا بیٹی! اقم جیتیں۔ اب تیار ہو جاؤ۔ رندھیر رات کے وقت شہر سے

باہر اس ٹیلے کے قریب جس کی چوٹی پر پیل کا درخت ہے تمہارا انتظار کرے گا  
تم دونوں کے لیے گھوڑے وہاں موجود ہوں گے لیکن کسی کو خبر نہ ہو۔  
انہار تشکر کے لیے مومہنی کی زبان موزوں الفاظ تلاش نہ کر سکی۔ اس نے  
احسان مندانہ ٹنکا ہوں سے رام داس کی طرف دیکھا اور چپکے سے دو آنسو بہا دیے۔

(۲)

رات کے وقت رام داس دیر تک مکان کی چھت پر بیٹھنے کے بعد چارپائی  
پر لیٹ گیا۔ اس کے دل پر ایک ناقابل برداشت بوجھ تھا۔ اسے اپنا وسیع  
مکان سونا معلوم ہوتا تھا۔ آج سے دس برس پہلے زندہ ہیر کی ماں کی وفات کے  
بعد اس کی زندگی کی تمام دلچسپیاں اپنے اکلوتے بیٹے پر مرکوز تھیں۔ بچپن سے  
لے کر اب تک زندہ ہیر کی مختلف تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہی تھیں۔  
وہ کم سن بچہ جو اس کی گود میں بیٹھ کر اپنے ننھے ہاتھوں سے اس کی مونچھیں پکڑ  
کر قہقہے لگایا کرتا تھا جو اس کی انگلی منہ میں لے کر اپنے چھوٹے چھوٹے دانتوں  
سے کاٹنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اسے درد کی بجائے راحت ہوتی۔ وہ ہونہار  
لڑکا جسے وہ شاہسواری، تیر اندازی اور تیغ زنی کے کرب سکھایا کرتا تھا۔ اور  
پھر وہ نوجوان جس کی ہر بات اسے دنیا بھر کے انسانوں سے زالی نظر آتی تھی اسے  
زندہ ہیر کی شکل میں بادشاہوں کا جلال اور دیوتاؤں کی پاکیزگی نظر آتی۔ دن میں کئی بار  
اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے "میرا بیٹا! میرا زندہ ہیر!"

زندہ ہیر کی ماں مومہنی کی ماں کی سہیلی تھی اور ارجن، رام داس کے بہترین دوستوں  
میں سے تھا اس لیے زندہ ہیر کے ساتھ ارجن اور ساوتری کی دلچسپی ایک قدرتی

بات تھی۔ وہ زندہ ہیر اور مومہنی کے مستقبل کا فیصلہ اپنے دل میں ایک مدت سے کر  
چکا تھا لیکن تازہ واقعات کے غیر متوقع طوفان نے اس کی امیدوں کے چراغ بجھا  
دیے تھے۔ شانتا کے ساتھ زندہ ہیر کی محبت کا انکشاف اس کے لیے ناقابل برداشت  
تھا۔ پھر بھی اسے امید تھی کہ وہ اس کی ڈانٹ ڈپٹ سے سمجھ جائے گا لیکن ماحضو  
اور شانتا کے باپ کا علم ہونے کے بعد اسے مایوسی کا آخری گھونٹ حلقی سے اتارنا  
پڑا۔ سکھ دیو کے ساتھ پرانی محبت نے اسے پھر ایک بار سماج کا باغی بنا دیا۔ وہ  
زندہ ہیر اور مومہنی کو رخصت کر چکا تھا۔

نو کرنے آج بھی حسب معمول زندہ ہیر کا بستر اس کے قریب بچھا دیا تھا۔  
رام داس نے بیٹے بیٹے ہاتھ بڑھا کر زندہ ہیر کے خالی بستر سے تکیہ اٹھا کر سینیے  
لگا لیا۔ وہ آنکھیں جو ایک مدت سے آنسوؤں سے نا آشنا تھیں پُر ہم ہو گئیں اس  
نے ورد بھری آواز میں کہا: "زندہ ہیر! میرے بیٹے، تم آج جنگل میں کس طرح دن...  
..... گزارو گے تمہیں شاید پتھروں پر لیٹنا پڑے اور میں!..."

رام داس یہ کہہ کر اٹھا اور پھر آہستہ آہستہ ٹپکنے لگا۔ قریباً اسی رات  
کے وقت اس نے ایک نوکر کو آواز دے کر بلایا اور گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔ نوکر  
ی حکم سن کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد آکر کہنے لگا: "سہ کار گھوڑا تیار ہے لیکن ارجن  
نیچے گھڑا آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

رام داس نے کہا: "اور پرے آؤ اور خود اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔"

(۳)

ارجن نے اوپر آتے ہی کہا: "ہمارا راج! مومہنی رات ہونے ہی گھر سے نکلی تھی

ابھی تک نہیں آئی۔ میں تمام شہر میں اسے تلاش کر چکا ہوں۔ زندہ ہیر کہاں ہے؟  
 رام داس نے جواب دیا: "زندہ ہیر یہاں نہیں ہے تم بیٹھ جاؤ۔"  
 "نہیں، میں بہت پریشان ہوں۔ زندہ ہیر کب سے گھر میں نہیں؟"  
 رام داس نے کہا: "ارجن! تم بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"  
 ارجن نے پوچھا: "تو مرنی کے متعلق آپ کو کوئی علم ہے؟"  
 "ہاں! بیٹھ جاؤ۔"

ارجن پریشان ہو کر بیٹھ گیا۔

رام داس نے کہا: "ارجن! تم سکھ دیو کو بھولے تو نہیں ہو گے؟"  
 ارجن نے جواب دیا: "میں سکھ دیو کو کیسے بھول سکتا ہوں لیکن اس بات کا مرنی سے کیا تعلق ہے۔"

رام داس نے جواب دیا: "ارجن! زندہ ہیر اور مرنی ہمیں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔"  
 ارجن اٹھ کر کھڑا ہو گیا: "بھاگ گئے؟ اس نے بدحواس ہو کر پوچھا۔"  
 "ہاں! بھاگ گئے۔ زندہ ہیر سکھ دیو کی لڑکی کے پیچھے اور مرنی اس کے لڑکے کے پیچھے۔"

"سکھ دیو کی لڑکی اور لڑکا ہیں آپ کی بات نہیں سمجھا۔ بھگوان کے لیے مجھے پریشان نہ کیجیے۔"

رام داس نے اٹھ کر ارجن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "ارجن! میں سچ کہتا ہوں۔"

ارجن نے کہا: "لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا وہ اچھوت...؟"

ہاں وہ اچھوت سکھ دیو کی لڑکی اور لڑکا تھے۔"

ارجن کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ بالآخر غضب ناک ہو کر بولا۔

نہیں! میں یہ نہیں مانتا۔ یہ جھوٹ ہے۔ وہ اچھوت ہیں۔ شہر کا ہر آدمی جانتا ہے کہ وہ اچھوت ہیں۔ تم اپنا دھرم چھوڑ چکے ہو اور اپنے بیٹے کو معاف کر سکتے ہو لیکن اگر مرنی اس بد معاش کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو میں قسم کھاتا ہوں کہ ان دونوں کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔ میں اس پاس کی بستیوں کے تمام اچھوتوں کو قتل کر دوں گا۔ آج تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ اس ذلیل شہر نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا اور تم اسے کالی دیوی کے مندر سے نکال لائے۔ مجھے بتاؤ وہ کہاں ہے؟ میں اپنے تمام بستیوں میں تلاش کر چکا ہوں۔ بے شک تم سرور ہو لیکن میں بے غیرت نہیں ہوں۔ میں سچ بتانے سے پہلے پہلے تمام شہر کے لوگوں کو اکٹھا کر کے شہر والوں کی بستیوں پر حملہ کر دوں گا۔ تم سرور ہو تب اسے پاس سپاہی میں لیکن تم اس طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔"

تمام حالات میں رام داس ایسے الفاظ برداشت کرنے کا عادی نہ تھا۔ لیکن ارجن کی باتیں سن کر غصہ پی گیا اور نہایت نرمی سے بولا۔

"ارجن! تم جانتے ہو میں نے دنوں میں سے نہیں لیٹیں بے گناہوں کو ظلم کرنے سے بچانے کے لیے خون کا آخری قطرہ تک بہا دوں گا۔ لیکن تم میری بات پر یقین کرو۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ وہ سکھ دیو کا بیٹا ہے۔ میں اس کا ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ سکھ دیو کو قید سے پھر لانے میں تم میرے ساتھ تھے۔ اس نے باغیوں کے سرور کی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ سکھ دیو مر چکا ہے۔ لیکن اس کی بیوی اور بچے زندہ ہیں۔ وہ اس شہر کے نزدیک آکر آباد ہو گئے۔ سماج نے ان کے لیے شہر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر رکھے تھے لیکن بھگوان کے کھیل نیا ہے ہیں۔ اس نے زندہ ہیر اور مرنی کو ان کی جھونپڑی کا راستہ بتا دیا۔ ارجن کا غصہ آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھا: "لیکن آپ کو کیسے"

یقین ہوا کہ وہ سکھ دیو کے بچے ہیں؟  
 رام داس نے جواب دیا میں سکھ دیو کی انگوٹھی اور وہ تلوار جو میں نے اسے قید  
 سے نکال کر رخصت کرتے وقت دی تھی دیکھ چکا ہوں اندر یہ تم بھی دیکھ چکے ہو اس  
 لڑکے کی شکل بالکل سکھ دیو سے ملتی تھی۔

ارجن نے کہا ”پھر بھی میں مومنی کو قابلِ معافی نہیں سمجھتا۔ اس نے میرے  
 منہ پر سیاہی تھوپی ہے مجھے دنیا میں کہیں کا نہ چھوڑا۔ سکھ دیو کا بیٹا ایک نیچ  
 ذات عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ وہ چندال ہے۔“

رام داس نے کہا: ارجن! محبت اور نیچ نیچ نہیں دیکھتی۔ اس کا تعلق سلج  
 سے نہیں۔ انسانیت سے ہے۔ تم ہی بناؤ! ہمارے شہر میں اس لڑکے جیسی  
 شکل و صورت کس کی ہے۔ تم کسی زمانے میں باغیوں کے سردار کی لڑائی کے ساتھ  
 سکھ دیو کے عشق کو حق بجانب خیال کرتے تھے اور میری طرح یہ کہتے تھے کہ ان  
 دونوں کو بھگوان نے ایک دوسرے کے لیے بنایا ہے میں آج بھی یہ کہتا ہوں کہ  
 سکھ دیو کے بیٹے اور تمہاری بیٹی کے ملاپ میں بھگوان کا ہاتھ ہے۔ وہ مومنی  
 کے لیے سرگموانے کے لیے تیار تھا اور مومنی اس کے لیے دریا میں گرنے اور پہاڑ  
 سے چھلانگ لگانے کے لیے تیار تھی۔ مجھے تمہاری تکلیف کا احساس تھا لیکن  
 جب مجھے یقین ہو گیا کہ مومنی اس کے لیے سب کچھ بار بیٹھی ہے۔ میں اس کا  
 راستہ نہیں روک سکا مجھے مومنی کا اتنا ہی دکھ ہے جتنا کہ رند جھیر کا۔

ارجن نے کہا لیکن دنیا کیا کہے گی؟  
 دنیا! میرے دوست۔ دنیا کی زبان آج تک کسی نے بند نہیں کی۔ تم دنیا  
 کو خوش کرنے کے لیے اپنے بچوں کا بلیڈان نہیں دیکھ سکتے۔

”اور دھرم؟“

”ہم دھرم کی آڑ لے کر فطرت کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ انسانیت کا  
 چہرہ مسخ کر رہے ہیں۔ ایک انسان کو دوسرے انسان سے نفرت اور حقارت  
 کا سبق دے رہے ہیں۔ بھگوان کے بنائے ہوئے انسانوں کے درمیان اور نیچ اور  
 نیچ کی دیواریں کھڑی کر رہے ہیں۔ ایسا دھرم نہ بھگوان کو خوش کر سکتا ہے اور نہ  
 بھگوان اسے بنائے ہوئے انسانوں کی بھلائی کر سکتا ہے۔“

ارجن تھوڑی دیر کے وقفے کے بعد بولا: ”تم یہ باتیں اس لیے کر رہے ہو کہ  
 رند جھیر ایک مرد ہے تم اس کے گھر سے بھاگ نکلنے کے متعلق کئی بہانے تراش  
 سکتے ہو لیکن میں ایک لڑکی کا باپ ہوں۔ کل شہر کا ہر بچہ اور بوڑھا مجھ سے مومنی  
 کے متعلق پوچھے گا میں انہیں کیا جواب دے سکوں گا؟“

رام داس نے کہا: ”فرض کرو اگر وہ مایوسی کی حالت میں دریا میں کود جاتی یا  
 پہاڑ سے چھلانگ لگا دیتی تو تم پوچھنے والوں کو کیا جواب دیتے؟“

”رام داس! میری عزت بچاؤ! مجھے بتاؤ۔ وہ کہاں ہے؟ میں اسے سمجھا  
 لوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کی خطا معاف کر دوں گا۔“

”ارجن! میں صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ سکھ دیو کے بیٹے کے ساتھ جا چکی  
 ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کا ارادہ تبدیل نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے کہ اس کا دل  
 تمہاری باتوں سے پسچ جائے اور وہ اپنی مرضی کے خلاف تمہارے ساتھ لوٹ  
 آئے لیکن دوبارہ تمہارے گھر آنے کے بعد وہ ایک جیتی جاگتی مومنی نہیں ہوگی بلکہ  
 ایک بے جان اور بے روح لاش ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ تم سماج کے قانون کی عزت  
 کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہو لیکن اپنے دل سے پوچھو۔ جس میں سماج  
 کے احترام سے زیادہ ایک باپ کی محبت کی دھڑکنیں ہیں۔ کیا مومنی کھل گئی  
 کہ جان دینا تم برداشت کر سکو گے؟ ارجن! میری بات کا جواب دو۔ کیا شادی

سے پہلے تمہیں اسی قوم کی ایک لڑکی سے محبت نہ تھی؟ اگر وہ تمہاری محبت کو ٹھکرا کر اپنے باپ کے ساتھ پہاڑوں میں چلی جاتی تو تم اس کے لیے تہاج کے بر قانون کو توڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ کیا اب بھی تمہیں اس کا خیال کبھی پریشان نہیں کرتا۔ اگر وہ تمہارے ساتھ زندگی بسر کرنا منظور کر لیتی تو تم اچھوتوں کی جھوٹریوں کو شہر کے محلات پر ترجیح دینے کے لیے تیار نہ تھے؟ یا وہ ہے میں تمہیں سمجھا کر گناہ تھا اور تم مجھے اپنا دشمن خیال کرتے تھے کیا تم وہی ارجن ہو؟

ارجن ایک زخم خوردہ انسان کی طرح مدھال ہو کر چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے آج سے بیس سال قبل کے واقعات کی تصویریں گزر رہی تھیں وہ سہانی صبح جب اس نے ایک شوہر لڑکی کو دریا پر نہانے دیکھا تھا۔ وہ چاندنی رات خیب وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہا تھا: "سنی اپنی تمہارے لیے تنگ کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہوں اور اس کے جواب میں اس کے گھوڑے بھالے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میس برس کے بعد پھر ایک بار اس کے کانوں میں گونج رہے تھے:

"نہیں! نہیں! اب مجھے معلوم نہ تھا کہ تم راجہ کے سپاہی ہو۔ تمہاری گردن پر ہماری قوم کے سینکڑوں بے گناہوں کا خون ہے۔ تم تھانے دشمن ہو۔ میں تم سے پریم کرنے کی بجائے مرجانا بہتر سمجھتی ہوں۔ مجھے تمہاری کسی بات پر اعتماد نہیں۔"

ارجن داس نے کہا: "کیوں ارجن! میں غلط تو نہیں کہتا؟" ارجن چونک کر رام داس کی طرف متوجہ ہوا اور بولا: "رام داس! مجھے شرمندہ نہ کرو۔ وہ جوانی نادانی تھی میں اس وقت بے وقوف تھا۔" ارجن نے کہا: "نہیں! صرف تم ہی نہیں!! اس عمر میں ہر انسان بے وقوف ہوتا ہے۔"

میں خود بھی اگر تمہاری یا سکھ لڑکی جگہ ہوتا تو یہی کرتا۔ اور اگر زندہ حیر کی ماں کھڑی ہونے کی بجائے کسی اچھوت کے گھر میں جنم لیتی تو میں بھی اس کے لیے سماج کے کسی قانون کی پروا نہ کرتا۔ تم اسے جوانی کی نادانی کہتے ہو لیکن میں اسے فطرت کے قانون کی پیروی سمجھتا ہوں۔ قدرت جب دو دونوں کو بلا ناچاہتی ہے تو اونچ نیچ کی دیواریں توڑ دیتی ہے۔ قدرت نے کسی کو بڑا اور کسی کو چھوٹا نہیں بنایا۔ ہمارے سماج کا یہ قانون فطرت کے قانون کے خلاف ایک بغاوت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سماج سے بغاوت موہنی اور زندہ حیر کے لیے ایک عارضی اذیت ہوگی لیکن سماج کے خوف سے اگر وہ فطرت کے قانون کو ٹھکرا دیتے تو ان پر ایک دائمی عذاب مسلط رہتا۔

ارجن نے لا جواب سا ہو کر کہا: "رام داس! مجھے معاف کرنا میرے منہ سے چند تلخ باتیں نکل گئیں لیکن موہنی کی جدائی اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے! اس کی ماں کا کیا حال ہو گا؟"

رام داس نے جواب دیا: "ماں کو اپنے بچوں کی زندگی سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں ہوتی۔ موہنی کی ماں کے لیے اس سے بڑھ کر اچھی خبر اور کیا ہو سکتی ہے کہ موہنی زندہ ہے اور خوش ہے۔"

"لیکن اگر وہ اس سے ملنا چاہے تو پہاڑوں میں ہم اسے کہاں ڈھونڈ سکتے ہیں۔"

ارجن نے جواب دیا: "اس بات کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔" وہ اس وقت کہاں ہے؟

"اس وقت تم گھر جا کر بہن ساوتری کو تسلی دو۔ میں چند دنوں تک تم دونوں کو اس کے پاس لے چلوں گا۔ اگر کوئی پوچھے تو کہہ دینا۔ موہنی دیا کے پار اپنے



کر اودھو دھو دیکھنے لگے۔ رندھیر نے کہا: کون لا لالو؟  
لالو نے قہقہہ لگاتے ہوئے آگے بڑھ کر رندھیر کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور بولا: کیوں جی آپ کہتے تھے آپ کو تمام راستے معلوم ہیں اگر میں آگ نہ جلاتا تو کیا بنتا۔ اب یہاں اتر جائیے آگے وصلان ذرا خطرناک ہے۔  
وہ دونوں نیچے اتر پڑے اور رندھیر نے موتی کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور لالو سے پوچھا: راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟  
لالو نے جواب دیا: راستے میں تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی لیکن میں نے یہاں پہنچ کر دیکھو کے متعلق بتا دیا تھا۔ مادھو، اس کی ماں اور شانتا اب تک روئے نہیں ہیں۔

رندھیر نے ایک شہادت آمیز تبسم کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ شانتا میرا  
اور رندھیر کو کائنات کے مغموم چہرے پر ایک دلغریب تبسم نظر آنے لگا۔  
اس نے کہا: پہلے موتی کو بلاؤ۔  
شانتا نے جواب دیا: اسے ماما نے اس وقت بلا دیا تھا جب آپ سو رہے تھے۔  
رندھیر نے پیالہ لے کر مزے لگا لیا۔ دودھ میں اس کے لیے آج ایک  
نئی مٹھاس، ایک نئی لذت تھی۔  
(۳)  
تھوڑی دیر بعد رندھیر نے اپنا پیالہ لالو نے بھاگ کر اس کے گھوڑے کی لگام  
پکڑ لی۔ موتی اور رندھیر نے آگے بڑھ کر اس کے پاؤں چھوئے اور ان کی دیکھا

علی الصباح جب موتی کی آنکھ کھلی تو کنول چھک چھک کر اسے چوم رہی تھی  
موتی بائیں ہینڈل کر کنول کے ساتھ چپٹ گئی۔  
ماما!

موتی نے اٹھ کر تشکر کے لیے دو آنسو بہا دیے۔  
رندھیر چشمے کے کنارے بیٹھا منہ ماتھ دھو رہا تھا۔ شانتا بکری کے دودھ  
کا ایک پیالہ لے کر اس کے پاس پہنچی اور خاموش کھڑی ہو گئی۔ رندھیر اس کی موجودگی  
سے باخبر تھا لیکن وہ جان بوجھ کر دیر تک دوسری طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر شانتا  
نے کہا: لیجئے۔  
رندھیر نے ایک شہادت آمیز تبسم کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ شانتا میرا  
اور رندھیر کو کائنات کے مغموم چہرے پر ایک دلغریب تبسم نظر آنے لگا۔  
اس نے کہا: پہلے موتی کو بلاؤ۔

شانتا نے جواب دیا: اسے ماما نے اس وقت بلا دیا تھا جب آپ سو رہے تھے۔  
رندھیر نے پیالہ لے کر مزے لگا لیا۔ دودھ میں اس کے لیے آج ایک  
نئی مٹھاس، ایک نئی لذت تھی۔

(۳)

تھوڑی دیر بعد رندھیر نے اپنا پیالہ لالو نے بھاگ کر اس کے گھوڑے کی لگام  
پکڑ لی۔ موتی اور رندھیر نے آگے بڑھ کر اس کے پاؤں چھوئے اور ان کی دیکھا

مادھو اور شانتا بھی اس کے پاؤں چھونے کے لیے آگے بڑھنے لگے۔ رام داس نے  
شانٹا کے سر پر پیاز سے ہاتھ رکھتے ہوئے کنول کی طرف دیکھا اور کہا: "بہن! مجھے  
پہچانتی ہو؟"

کنول نے اس کی طرف احسان مندا نہ کیا ہوں اسے دیکھا اور جواب دیا  
"بھلا میں آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں؟" یہ کہنے لگی۔  
دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے بالآخر  
رام داس بولا: "بہن! یہ جگہ آپ کے لیے محفوظ نہیں۔ آپ کو فوراً یہاں اسے دور  
چلے جانا چاہیے۔ اس اوچھے پہاڑ کے واسطے میں آپ کی قوم کے بہت سے لوگ  
آباد ہیں۔ کل تک آپ وہاں پہنچ جاتیں گی۔ شاید راستے سے آپ واقف نہ ہو  
لیکن اس پہاڑی کے نیچے آپ کو کوئی نہ کوئی چرواہا یا شکارچی ضرور مل جائیگا۔  
کنول نے جواب دیا: "میں اس علاقے کے چچے چچے سے واقف ہوں اور  
مجھ سے زیادہ تیرا اور لاو ان راستوں کو جانتے ہیں۔"

پھر تیرا ہاتھ باندھتے چلتے قدم کے غلطی پر کھڑا تھا۔ رام داس نے اس کی  
طرف دیکھ کر سوال کیا: "تم ان کے ساتھ جا رہے ہو؟"

"جی ہاں راج! اس نے جواب دیا۔  
"بہت اچھا! اب دیر نہ لگاؤ۔ میں تھوڑی دیر تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

لاو، رام داس کے گھوڑے کی باگ باوھو کے ہاتھ میں دے کر تیرے  
ساتھ بھیریں اور کیریاں ہانکنے لگا۔ رام داس نے مادھو کے ہاتھ سے گھوڑے  
کی باگ پکڑ لی اور مادھو کو دو سرے دو گھوڑے جو قریب ہی ایک  
اچھاڑی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے، کھول لائے۔ اپنے کہا: "جب وہ  
گھوڑے لے آئے تو وہ موہنی اور شانتا کی طرف متوجہ ہوئے۔ رام داس نے گھوڑوں

پر چڑھ کر سوار ہوئے۔ رام داس نے اپنی آنکھیں پٹیوں سے چھپائی تھیں لیکن رام داس کے اصرار پر مادھو  
نے موہنی اور مادھو نے شانتا کو گھوڑوں پر بٹھا دیا۔ رام داس نے  
رام داس نے کنول سے کہا: "بہن! تم میرے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔  
کنول نے جواب دیا: "نہیں! میں اپنی چلوں کی۔"  
رام داس نے کہا: "نہیں! میں اپنی چلوں کی۔"  
رام داس نے کہا: "نہیں! میں اپنی چلوں کی۔"

رام داس نے رام داس کی تاکید کی اور کنول مجبور ہو کر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔  
رام داس، رندھیر اور مادھو، کنول، شانتا اور موہنی کے گھوڑوں کی ہکامیں پکڑ کر  
ایک تنگ اور دشوار گزار گھاٹی پر چلے گئے۔

رام داس نے راستے میں کنول سے ہکامیہ کے متعلق پوچھا اور وہ اس کی  
قد سے رہا ہونے کے بعد اس کی موت تک واقعات بیان کرنے لگی جب مادھو  
کا ذکر آیا تو وہ بے اختیار رو پڑی۔ تمام داستان سننے کے بعد رام داس نے کہا  
"بہن! افسوس ہے تم اپنی دیکھیں یہاں تھیں اور مجھے خبر نہ ہوئی۔ مجھے بدھو کی  
موت کا ذکر ہے اب اس کی جگہ رندھیر اور موہنی آپ کو سنو۔ رام داس نے  
رام داس نے رندھیر کی طرف دیکھا اور وہ ہنسنے لگا۔ اس نے ہنسی  
کے ساتھ کہا: "بہن! میں نے تمہاری موت کی خبر سنی تھی۔"  
رام داس نے کہا: "بہن! میں نے تمہاری موت کی خبر سنی تھی۔"  
رام داس نے کہا: "بہن! میں نے تمہاری موت کی خبر سنی تھی۔"  
رام داس نے کہا: "بہن! میں نے تمہاری موت کی خبر سنی تھی۔"

چھاپے تھے۔ موہنی کے پھرے سے اس کی دل کی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے  
 رام داس نے اس کے قریب جا کر کہا: بیٹی! میں تمہیں ایک خوش خبری سنانا چاہتا  
 ہوں۔ تمہارا تارا ت میرے پاس آیا تھا میں نے اس کی تسلی کر دی ہے وہ اب تم  
 سے خفا نہیں ہے۔ یہ معلوم نہ تھا کہ باوجود سبکدوش کا بیٹا ہے میں نے اس سے عہد  
 کیا ہے کہ بہت جلد اسے اور تمہاری ماما کو تمہارے پاس لادوں گا۔ جب اس کا  
 دل بہا اس کے بعد وہ رند صبر سے مخاطب ہوا: بیٹا! مجھے چند دن تک اپنے نئے  
 گھر کا پتہ دینا۔  
 رند صبر نے معلوم کئے میں کہنا: "پتا جی! آپ تمہارے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟"  
 رند کنول بولی: "ماں بھیا! چلو ہمارے ساتھ۔"  
 موہنی نے کہا: "چلو چچا!"  
 اس باوجود نے کہا: "ماں چلیے! وہاں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"  
 یہ سنانا آپ تک خاموش تھی۔ رام داس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:  
 "لیکن بیٹی! شہناشا بد مجھے ساتھ لے جانا پسند نہیں کرتی وہ ابھی تک خاموش ہے۔"  
 رند شہناشا نے بدحواس ہو کر سب کی طرف دیکھا اور کہنے لگی: "پتا جی! اگر آپ  
 میرا کہاں لیں تو میں ایک بار تین ہزار بار کہتی ہوں کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔"  
 رام داس نے شفقت آمیز لہجے میں کہا: "بیٹی! میں تمہاری کسی خواہش کو  
 رو نہیں کر سکتا۔ میں بہت جلد تمہارے پاس آؤں گا۔ وہ جھونپڑی جس میں تم اور رند  
 رہو گے، مجھے شہر کے محلات سے کہیں زیادہ عزیز ہوگی لیکن اس وقت میرے  
 فرائض مجھے شہر چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں وہاں رہ کر ہزاروں مظلوم  
 لوگوں کی حفاظت کر سکتا ہوں۔ اگر میں آج شہر چھوڑ دوں تو ممکن ہے کہ میری جگہ پھر  
 کوئی گنگا رام جیسا آدمی شہر کا سردار بنایا جائے اور اچھوتوں کے بلیڈان کے لیے

کالی دیوڑی کے مندر کے دروازے پھر کھل جائیں۔ جب تک مجھے یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ میز پر جگہ لینے والا کوئی رحم دل انسان ہے میں وہاں رہ کر ان لوگوں کی سخت کرباں ہوں گا۔ یہ ہے کہ خدا کا یہاں رہنے والا ہے۔

۸۔ دندھیر نے کہا: لیکن یتاجی ان واقعات کے بعد برہمن راجہ کے پاس جا کر آپ کی شکایت عرض کر دیں گے اور ممکن ہے کہ راجہ آپ کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرے۔ بے شک توہ آپ کی بہت عزت کرتا ہے لیکن مجھے اندھنوں کو وہ یہ سب باتیں برداشت کرنے کا ارادہ نہ تھا۔

مذاہم داس نے جواب دیا: راجہ سب کچھ برواشت کر سکتا ہے لیکن یہ برواشت نہیں کر سکتا۔ کہ وہ اپنی ریاست کے ایک حصے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے اسے یقین ہے کہ میرے سوا کوئی آدمی سردارانِ لوگوں کو پر امن رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اب ان لوگوں میں بغاوت کی روح باقی نہیں رہی۔ پھر بھی گوشہ راجائیوں میں نا کامیوں کا اس کے دل پر گہرا اثر ہے۔ وہ دل ہی دل میں آج تک ان برمنوں سے نفرت کرتا ہے۔ جنہوں نے اسے سکھاری کے خلاف بھڑکایا تھا۔ پہلے ان لوگوں کے ساتھ میری رواداری مصلحتوں کی بنا پر تھی۔ اب میں ان کے ساتھ ہمدردی کرنا اپنا دھرم سمجھتا ہوں۔ میری رواداری ان کے لیے ایک خواب اور نقشہ مٹی۔ میری ہمدردی انہیں اب خواب سے بیدار کرنا چاہتی ہے۔

رازم واس نے ناوھو کی طرٹ ویکھا اور کہا:   
 ان ناوھو میں تمہارے متعلق بہت مایوس ہوں۔ پسندوں سے دل بہلانے   
 والا انسان نہ اپنے لیے مفید ہو سکتا ہے نہ دوسروں کے لیے سماج   
 کو غلط قسم کے قوانین کی تبدیلی پر مجبور کرنے کے لیے خوشامد سے کام   
 لے رہا ہے۔ یہ دنیا ایک شاہراہ ہے جس پر مختلف قوموں کے قافلے

رہیں گزریں گے بن اور گزرتے رہیں گے۔ اس شاہراہ پر ہر قوم کو قدم قدم پر  
 پڑھنا پڑھنا کر دھوئیں، بھینا بھینا تار کیوں اور مینٹ طوفانوں سے  
 گزرتا پڑتا ہے۔ اس شاہراہ پر دوڑنے والے ہر قافلے کی یہ خوشیاں  
 پیانیہ ہے کہ وہ کسی سے پیچھے نہ رہے۔ لیکن تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ  
 قدرت کا یہاں کا سہرا صرف ان کے سر پر ہوتا ہے جن کا عزم ان کی  
 امانت کو دیکھ کر متزلزل نہیں ہوتا، جو انتہائی پامردی کے ساتھ  
 تار کیوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہیں جو قافلے ان گڑھوں کو گھسیٹ  
 دیتے ہیں۔ دیکھ کر دیکھ گئے جو طوفانوں اور تار کیوں میں سہم کر رہ گئے۔ قدرت  
 کے ہاتھ ان کی اعانت کے لیے نہ اٹھاتے تیر تار قافلوں نے نہیں کی ہیں  
 بلکہ ان پر ہمارے کر اپنے ہاتھ شامل کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ اپنا ہاتھ  
 ان پر لا دیا وہ گرسے اور پیچھے آئے والوں کے پاؤں تلے لپس میں  
 لٹا دیے کہ وہ گئے تاریخ کے صفحات پر صرف چند ترقی یافتہ قوموں کی  
 لکھی ہوئی نقش ہیں لیکن آج تک پستی کے گڑھوں میں گرنے اور تار کیوں میں  
 جسن بھٹک کر دم توڑنے والے انسانوں کو کسی نے توجہ کا مستحق نہیں سمجھا  
 اب ان کو دیکھتے ہیں کہ وہ انسانی ہمدردی سے نہیں بلکہ انسانی ہمدردی سے  
 وہ لوگ جو اس شاہراہ کی خوفناک گھاٹیوں کو اپنی لاشوں سے  
 پلٹتے ہیں جو تندر تیز طوفانوں کے مقابلے میں متزلزل نہ ہوئے  
 آوازیں چاہیں بن کر نکلتے ہیں جو وسیلہ شکن تار کیوں میں ایمان و عمل  
 کی مشعل روشن کرتے ہیں دنیا میں کامرانی اور کامیابی ان کے پاؤں  
 پر چلتی ہے۔ یہ شاہراہ کہیں ہے آپ دیکھا محاوروں اور کہیں سرسبز  
 شاہراہ نخلستانوں میں ہے گزرتی ہے۔ جنہوں نے صحرا کی کھنڈ

سے اپنا کونسلستانوں میں سستانے کی کوشش کی وہ اونگتے  
 اونگتے سو گئے اور وہ جوان سے بہت پیچھے تھے بہت آگے  
 نکل گئے اور جاتے جاتے انہیں جگانے کی بجائے غلامی کی آہنی  
 زنجیروں میں جکڑ گئے اور پھر ان کی یہ خواہش کہ انہیں ہمیشہ کے لیے  
 غلام رکھا جائے، محکموں کے لیے قانون بن گئی۔  
 جن لوگوں میں قوم نے زندگی کے چند سال گزارے ہیں وہ  
 بنے غلام ہوئے ہیں اور ان میں ابھی آزادی کی تھوڑی سی رت باقی  
 ہے لیکن تم ان اچھوتوں کو نہیں جانتے جو برسوں سے غلام چلے  
 آتے ہیں۔ وہ طاقتور کی بلا بھی کے اشارے کو بھگوانی کا قانون سمجھتے  
 ہیں۔ اگر تم انہیں جا کر یہ کہو کہ تم میں اور تمہارے اونچی ذات کے  
 آقاؤں میں کوئی فرق نہیں تو وہ حیرت سے تمہارا مزہ دیکھیں گے  
 اگر تم ان سے یہ کہو کہ آزادی تمہارا پسند الہی حق ہے تو وہ تمہیں زیادہ  
 کہیں گے اور اگر تم یہ کہو کہ بھگوان کی نظر میں اونچی اور نیچ ایک سا  
 درجہ رکھتے ہیں تو وہ تمہیں پانی سمجھیں گے حکمرانوں کی سماج کا قانون  
 ان کے لیے دھرم بن چکا ہے اور وہ آزادی کی ہر جدوجہد کو دھرم  
 کے خلاف اعلان جنگ سمجھتے ہیں اور جب کسی جماعت نے انسانوں  
 میں کتری کا اجناس دھرم کی حد تک پہنچ جاتا ہے تو اس کی اصلاح  
 بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ تاہم میں تمہیں مایوس نہیں کرنا چاہتا تاریخ  
 ہمیں بتاتی ہے کہ بعض قومیں عروج کی آخری بلندی سے گویں اور پستی  
 کی انتہائی گہرائی تک پہنچ گئیں اور بعض پستی کی آخری گہرائی سے  
 اٹھیں اور بلندی کے آخری تہے تک پہنچ گئیں لیکن یاد رکھو!

تم ان لوگوں میں شے نہیں جو گری ہوئی قوم کو بھڑکتے ہیں جو زور  
کواپنی لاشوں سے پاٹ کر ہموار کرتے ہیں جو طاقتور سے اپنا کھو یا  
ہوا حق واپس لینے کے لیے سیدہ سنہر ہونا جانتے ہیں۔ اونچی ذات  
والوں سے تمہاری جنگ اس لیے نہیں کہ انہوں نے انسانیت کئے  
تمام حقوق تم سے چھین لیے ہیں۔ نہیں! تم صرف اپنے طاقتور آقاؤں  
سے چند مراعات چاہتے ہو، اور وہ یہ کہ وہ تمہارے لیے اپنے مندروں  
کے دروازے کھول دیں، تمہیں اپنے کنوؤں سے پانی پینے دیں۔ اپنے  
شہروں میں داخل ہونے دیں اور اپنی موتیوں کی پوجا کرنے دیں۔  
تمہاری مثال اس آدمی کی سی ہے جس کے گھر بڑا کو قبضہ کر لیں اور  
اسے زنجیروں میں کس کر ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پھینک دیں اور  
وہ طاقت ور لیڈروں سے مروت ہو کر صرف یہ کہے کر یہ زنجیر جھٹکتی  
ہے اس لیے ذرا بڑھیلی کر دو۔ تنگ و تاریک کوٹھڑی میں میرا دم گھٹتا  
ہے اس لیے اس کا ایک روزن کھول دو۔ تاریکی میں میرا جی گھبرا رہا ہے  
اس لیے میری کوٹھڑی میں ایک چراغ روشن کر دو۔ جب تم میرے  
مکان کے کشادہ کمروں میں بیٹھ کر گاتے ہو تو میرا بھی جی چاہتا ہے  
اس لیے مجھے بھی گلا پھارنے کی اجازت دے دو۔ وہ صرف چند  
لمحوں کی بھیک مانگتا ہے اور یہ بھولی جانتا ہے کہ یہ تمام خزانہ اس  
کا تھا اور پھر چو ملتا ہے اسے اپنے لیے ایک بہت بڑا انعام سمجھتا  
ہے اور جو نہیں ملتا اس کے متعلق یہ خیال کرتا ہے کہ یہ اس کا حق  
ہی نہ تھا۔ غلامی بے بسی اور مجبوری اس کے لیے دھرم بن جاتی  
ہے۔ اور طاقت ور لیڈر اسے انسان نہیں دیکھتا نظر آتا ہے۔

فرض کرو اگر سماج تمہارے لیے اپنے مندروں کے دروازے  
کھول دے تمہیں اپنے کنوؤں سے پانی پینے، اپنے شہروں میں داخل  
ہونے اور اپنی موتیوں کی پوجا کرنے کی اجازت دے دے تو کیا  
تمہاری مثال اس شخص سے مختلف ہوگی جس کے گھر پر قبضہ کرنے والے  
اس کی التجاؤں پر اس کی تاریک کوٹھڑی کا روزن کھول دیں یا اس کے  
سلسلے ایک چراغ رکھ دیں۔

کیا یہ مراعات حاصل کرنے کے بعد تم سماج والوں کی برابری کا  
دعویٰ کر سکو گے؟ ہرگز نہیں۔ دو انسان ایک ہی کنوئیں کا پانی پینے  
ایک ہی موتی کی پوجا کرنے اور ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود  
آقا اور غلام ہو سکتے ہیں۔ اس دنیا میں طاقت ور کا ہاتھ ہمیشہ کمزور  
کے اوپر ہے گا۔ کمزور طاقت ور کے برابر بیٹھ کر بھی برابری کا دعویٰ  
نہیں کر سکتا۔ طاقتور، کمزور کی جھوٹی پٹری کو اگر عمل تعمیر کرتی ہے  
طاقت ور کی خواہش کمزور کے لیے قانون اور قانون سے دھرم  
بن جاتی ہے۔

مادھو اگر ہی ہوتی قوم کو اٹھانے کا کام بہت کمٹن ہے تمہارا  
باپ ایک بہادر آدمی تھا اس کے انا دے بہت بلند تھے اور  
میں سمجھتا تھا کہ قدرت نے اسے ایک گری ہوئی قوم کو اٹھانے کے  
لیے منتخب کیا ہے۔ وہ اس ملک میں ایک بہت بڑا انقلاب لا بیگا  
لیکن وہ حوادث کے مندر میں فقط ایک بار غوطہ لگانے کے بعد  
ہمیشہ کے لیے کنا سے پر بیٹھ گیا۔ وہ ان لوگوں کو جگانے کے لیے  
آیا تھا لیکن خود سو گیا۔ تاہم اس کے دل میں صداقت کے لیے

ایک تڑپ تھی۔ اُس نے ظلم برداشت کیا لیکن ظلم کا ساتھ نہ دیا۔  
اس نے مظلوموں کے ساتھ محبت کی لیکن اس کی محبت اسے مظلوموں  
کی دلداری کے لیے سیدہ سپر ہونے پر آمادہ نہ کر سکی۔

اگر بہن کنول برائے مانے تو میں یہ کہوں گا کہ اُس کے ذہنی انقلاب  
کا باعث یہ تھی اور اسی طرح تمہارا منتہائے مقصود موہنی ہے۔ تم  
اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے۔ تم اس جگہ جا رہے ہو جہاں آزاد  
لوگ بستے ہیں۔ وہاں موہنی کے ساتھ تھیں شہرول اور مندروں کا  
خیال نہ رہتا۔ تم یہ سب کچھ بھول جاؤ گے۔ تمہیں مورتیاں بننے  
کی بھی ضرورت نہیں ہے گی۔ لیکن اپنے دل کو یہ فریب نہ دینا کہ تم  
آزاد ہو اور آزاد ہو گئے۔ تم بھی ان لوگوں میں جا کر سو جاؤ گے۔ اور  
سونے والے زیادہ دیر اس کی نیند نہیں سوتے۔ اس دلداری سے  
کوئی گنگارام پھر اُٹھے گا اور بے فکری کی نیند سونے والے  
چرواہوں کو غلامی کی زنجیریں پہنائے گا۔

رام داس کی تقریر کے دوران مادھو کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور  
گئے۔ اُسے اس بات کا اعتراف تھا کہ موہنی اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو  
تھی اور وہ موہنی کے لیے زندگی کی ہر دلچسپی قربان کرنے کے لیے تیار تھا لیکن  
وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ اپنی کشتی کنا لے آگئے کے بعد وہ منجھڑا میں  
دوبنے والوں کی چیخ پکار سے کان بند کر لے گا وہ ایک تھکے ہوئے مسافر کی  
طرح کسی ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے کے کنارے تھوڑی دیر سوتا ہے  
کے بعد تازہ دم ہو کر صحرا میں بھٹکنے والے مسافروں کی رہنمائی کی تدبیریں سوچنا  
چاہتا تھا۔ ٹھنڈا اور میٹھا چشمہ موہنی تھی۔ جس کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے اس نے

صحراؤں میں کئی پہلے سے انسانوں کو دم توڑتے دیکھا تھا۔ موہنی کی محبت کو ایک  
خواب اور نشہ سمجھ کر سو جانے کی بجائے وہ اسے شاہراہ حیات کی بلند منازل کی  
طرف قدم اٹھانے کے لیے زوردار بنانا چاہتا تھا۔ موہنی کا سہارا لے کر وہ طوفان  
سے لڑ سکتا تھا۔ موہنی کو مشعل بنا کر وہ اپنے راستے کے تاریک گوشوں میں پاؤں  
رکھ سکتا تھا۔

تاہم رام داس کی تقریر کے بعد وہ اپنے دل میں ایک نیا اضطراب اور ایک  
نئی کشمکش محسوس کرتا تھا۔ وہ اپنے دل سے گریڈ کر گریڈ کر پوچھ رہا تھا: کیا گسے  
ہوئے انسانوں کو فقط ایک نڈر اور مستقل مزاج رہنا کی ضرورت ہے؟ کیا دنیا  
کے تمام مسائل کا علاج فقط طاقت ہی ہے؟ کیا کمزور طاقت ور ہو کر عام طور پر  
ظالم نہیں بن جاتا؟ کیا اس شاہراہ میں آگے بڑھنے والے طاقت ور انسانوں کا یہ  
حق ہے کہ وہ کمزور انسانوں پر اپنا بوجھ لا دیں۔ انہیں دھکیل کر ذلت اور غلامی  
کے گوشوں میں پھینک دیں؟ کیا طاقت ور کی بادشاہت کمزور کی غلامی کا باعث  
نہیں ہوتی؟

کچھ دیر سوچا کہ سوچنے کے بعد مادھو نے رام داس کی طرف دیکھا اور کہا:  
”آپ نے مجھے غلط سمجھا۔ میں بزدل نہیں۔ مجھ سے یہ بھی ممکن نہیں کہ میں اپنی  
زندگی کا آرام دھونڈ کر دوسروں سے لے پر رہا ہو جاؤں۔ لیکن گسے ہوئے انسانوں  
کو اٹھانے کے متعلق میرے خیالات آپ سے بہت مختلف ہیں میں طاقت ور کا  
یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کمزور کو پیس ڈالے۔ میں دنیا میں طاقت کا قانون نہیں،  
انصاف کا قانون چاہتا ہوں۔ طاقت کا قانون انسانوں کو ذہنی طور پر ذرا نہ بنا دیتا  
ہے اور اس دنیا میں ایک ایسی جنگ کا بیج پوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ظالم  
کمزور کو مظلوم اور مظلوم طاقت ور ہو کر ظالم بنتے رہیں گے۔ غلام آقا اور آقا

غلام بنفٹے رہیں گے۔ میں اس دنیا میں نہ کمزور کی غلامی چاہتا ہوں اور نہ طاقتور کی بادشاہت۔ میں طاقت کے لیے نہیں انصاف کے لیے لڑنا چاہتا ہوں اور دنیا میں انصاف کا قانون وہ ہوگا۔ جو آقا اور غلام کے وجود سے منکر ہو، جس میں چھوٹ اور اچھوت کا امتیاز نہ ہو جو انسان کو انسان کے احترام پر مجبور کرے جس کا خوف ایک طاقتور کو کمزور کے گھر پر قبضہ کرنے سے باز رکھ سکے۔

رام داس نے کہا: "بیٹا! یہ صرف تمہارے پسنے ہیں۔ دنیا کے کسی ملک میں ایسا قانون نہیں اور اگر کوئی ایسا قانون لے کر آیا بھی تو دنیا کے تمام سرکش انسان اس کے مقابلے کے لیے متحد ہو جائیں گے۔ دنیا میں بلند و است کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کرنا ایک ایسا کام نہیں جو صرف باتوں سے ہو سکے۔"

مادھو نے جواب دیا: "دنیا میں کسی شے کے نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی ضرورت سے انکار کیا جائے۔ غاروں میں رہنے والے انسانوں نے جھونپڑیاں بنانے کی ضرورت محسوس کی۔ جھونپڑیاں، تند ہواؤں اور تیز بارشوں میں کام نہیں دیتیں، تو وہ مٹی اور پتھر کے مکان بنانے پر مجبور ہوئے۔ امن دنیا کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ طاقت کے قانون کے ماتحت نہ ختم ہونے والی جگمگی انسان کو کسی ایسے قانون کا جو یا بنا دیں گی۔ میں مانتا ہوں کہ ایسے قانون کی احتیاج زیادہ تر انسانوں کا مظلوم طبقہ محسوس کرے گا اور کمزوروں کی ہڈیوں پر اپنے محل تعمیر کرنے والے اس کے مقابلے کے لیے اٹھیں گے لیکن صداقت کا لوہا رکھائے گا۔ ایسے قانون کی منتہی ہوگی۔ اس قانون کے علمبردار کسی ایسے بھگوان کا تخیل پیش کریں گے جو سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہو۔ وہ ایسے مندر تعمیر کریں گے جن کے دروازے چھوت اور اچھوت کے لیے یکساں طور پر کھلے ہوں۔ وہ دن دور نہیں جب انسان ذات سے نہیں بلکہ اعمال سے

پہچانا جائے گا۔ طاقت کی لامعنی نیکی کی تلوار کے سامنے جھک جائے گی۔ دنیا کی یہ جنگ ظلم کے خلاف نیکی کی جنگ ہوگی۔ اور میں اگر زندہ رہا تو اس جنگ میں ایک سپاہی بن کر شریک ہوں گا اور پھر دنیا دیکھے گی کہ میں بزدل نہیں۔"

رام داس نے کہا: "بھگوان کرے وہ وقت جلد آئے اور میں بھی تمہارا ساتھ دے سکوں۔ لیکن اگر کوئی ایسے قانون کا جھنڈا بلند کرنے نہ آیا تو۔۔۔"

مادھو نے منہ مسموم لہجے میں جواب دیا: "جس کے ہاتھ میں رات کے وقت پھلنے کے لیے مشعل نہ ہو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ صبح کا انتظار کرے۔ میں انتظار کرتا رہوں گا۔"

رام داس نے مسکراتے ہوئے کہا: "جب تک صبح نہ ہو شہر اور مندروں کا رنج نہ کرنا۔ تم اندھیرے میں بہت کچھ کھو چکے ہو۔"

کنول بولی: "نہیں اب اس کی رکھوالی کروں گی۔"

کنول کو اس موقع پر بدھو کا خیال آیا اور اس کی مسکراہٹ اچانک پڑھری میں تبدیل ہو گئی۔

رام داس نے رندھیر کی طرف دیکھا: "اچھا اب مجھے دیر ہو رہی ہے۔ بیٹا! بہن کنول کو اپنی ماں سمجھنا۔ شانتا کو کوئی تکلیف نہ ہونے دینا۔ مادھو کو اپنا بڑا بھائی سمجھنا اور مادھو تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ مرنی کو کوئی تکلیف نہ ہو اور بہن کنول! ان کی شادی کی رسوم کے لیے ہماری سماج کا کوئی پروہت رضامند نہیں ہو گا۔ میں یہ چاہتا بھی نہیں کہ انہیں اس بات کا علم ہو۔ پندرہ دن تک رندھیر کو میرے پاس بھیج دینا۔ میں اُس کے ساتھ آ جاؤں گا۔ اور مرنی! تمہارے پتا کو بھی لیتا آؤں گا۔"

مرنہی اور شانتا کے چہروں پر حیا کی سُرخی دوڑ رہی تھی۔ رندھیر اور مادھو

کے دل میں مسرت کا ایک طوفان لہریں لے رہا تھا۔ کنول کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھپک رہے تھے۔

رخصت ہوتے وقت رام داس نے اپنا گھوڑا کنول کو دے کر پیدل لوٹنا چاہا لیکن کنول نے رام داس کی تکلیف کے احساس سے گدھے کی سواری کو ترجیح دی اور اسے مجبوراً اپنا گھوڑا لینا پڑا۔

(۵۵)

بادلوں کے قافلے مشرق کے اونچے پہاڑوں سے اٹھ اٹھ کر مغرب کے وسیع میدانوں کا رخ کر رہے تھے۔ رام داس نے پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر گھوڑا روکا اور مڑ کر نیچے دیکھنے لگا۔ کنول اور اس کے ساتھی واوی سے گزر کر ایک بل کھاتی ہوئی پگ وڈنٹی کے راستے پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔ رام داس دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ جب یہ قافلہ پہاڑی کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اس نے گھوڑے کی باگ و بصلی چھوڑ دی اور آہستہ آہستہ پہاڑ سے نیچے اترنے لگا۔

خیالات کے جھوم نے رام داس کو اپنے گرد و پیش سے بے خبر کر دیا۔ وہ تصور میں کسی اونچے پہاڑ کے دامن میں جہاں جگہ جگہ آبشار تھے۔ کسی جھیل کے کنارے دیو دار اور چتر کے بلند درختوں کے درمیان ایک چھوٹی سی جھونپڑی دیکھ رہا تھا وہ جھونپڑی جس میں اس کا بیٹا اور بہنوئی تھے وہ ان دونوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ شانتا ایک ننھے سے خوبصورت بچے کو اپنی گود سے اٹھا کر اس کی گود میں ڈال کر رہ رہی تھی۔

جاؤ اپنے بابا کے پاس اقم بہت شری ہو اور وہ بچہ اپنے نازک ہاتھوں

سے اس کی مونچھیں پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اس کی انگلی پکڑ کر اپنے منہ میں ڈال رہا تھا اور وہ اس کے ہاتھ اور پاؤں چوم رہا تھا۔

(نسیم مجازی)

کوٹہ

سلطان احمد خوش نویس گجرات ۶۷۴